عذابِ آگہی
محی الدین نواب

عذاب آگہی

ایک نوجوان کی داستانِ عجب جس کے ذہن پر آئندہ پیش آنے والے جان لیوا واقعات کے عکس ابھرتے تھے۔ کوئی اسے پاگل کہتا تو کوئی کالی زبان والا، لیکن اس کے منہ سے نکلی ہوئی پیش گوئی پوری ہو کر رہتی تھی۔ پھر اس کے پردہ ذہن پر ایک ایسا منظر ابھرا کہ وہ لرز کر رہ گیا۔ دوسروں کو آگہی کے عذاب میں مبتلا کرنے والا خود عذابِ آگہی میں مبتلا ہو گیا۔

پاگل خانے کا چیف میڈیکل آفیسر معائنے کے لئے آیا تھا اور اچانک ہی آیا تھا۔ پاگل خانے کے احاطے میں اس کی کار رکتے دیکھ کر سب گھبرا گئے تھے اور جلدی جلدی بھاگتے دوڑتے ہوئے اپنے دفتر کی فائلوں کو سلیقے سے رکھ رہے تھے۔ کرکٹ میچ دیکھنے والے ٹی وی کو الماری میں چھپا رہے تھے۔ کمنٹری سننے والے ریڈیو کو میز کے نیچے رکھ رہے تھے۔ فرش کی اور دیواروں کی صفائی ہونے لگی تھی۔ سارا عملہ یوں حرکت میں آگیا تھا جیسے وہ سب کے سب کھلونے ہوں اور ان میں چابی بھر کر انہیں چھوڑ دیا گیا ہو۔

چیف میڈیکل آفیسر کو اختصار میں سی۔ ایم۔ او کہا جاتا ہے۔ وہ پچھلی سیٹ پر اپنی لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ کار رکتے ہی وہاں کے سپاہی آکر اٹینشن ہوگئے۔ ایک نے آگے بڑھ کر پچھلا دروازہ کھولا۔ سی۔ ایم۔ او کی لڑکی پہلے کار سے اترنا چاہتی تھی لیکن وہ اچانک ٹھٹک گئی۔ سامنے کھڑے ہوئے سپاہی کو دیکھ کر اس نے زور سے دروازہ بند کیا۔ پھر اپنے باپ سے پوچھا۔ "پاپا! کیا یہی لوگ پاگل ہیں؟"

سی۔ ایم۔ او نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ کسی سپاہی کا بیلٹ درست نہیں تھا۔ کسی کے گریبان کا بٹن کھلا ہوا تھا۔ کوئی کچھ دیر پہلے شیو کر رہا تھا' آفیسر کی آمد کی خبر سنتے ہی ایسی حالت میں چلا آیا تھا کہ داڑھی کے بال کہیں کہیں نظر آرہے تھے۔ مونچھ ایک طرف سے تراشی ہوئی تھی۔ اسی وقت پاگل خانے کا انسپکٹر انچارج دوڑتا ہوا آیا۔ پھر دروازے کے سامنے ایڑیاں بجا کر اٹینشن ہوگیا۔ ہاتھ اٹھا کر سلیوٹ کیا۔ اس کی گردن کو ہلکا سا جھٹکا پہنچا تو سر کی وگ پیشانی کی طرف اس قدر کھسک گئی کہ دونوں آنکھیں آدھی چھپ گئیں۔ وہ آدھی آنکھوں سے اپنے آفیسر کو دیکھتا رہ گیا۔

سی۔ ایم۔ او کار سے اترتے ہوئے بولا۔ "باہر آؤ' بیٹی! میں تمہیں پاگلوں سے ملاؤں۔ ہمارے سرکاری اداروں کا عملہ یوں تو دماغی طور پر نارمل ہوتا ہے لیکن کوئی بڑا

آفیسر اچانک معائنے کے لئے آتا ہے تو یہ لوگ آدھے پاگل ہوجاتے ہیں کیونکہ انہیں اپنا جھوٹ، اپنی نااہلی اور اپنے بہت سے فراڈ چھپانے پڑتے ہیں۔ یہ ایک دانشورانہ قول ہے کہ سچ کو چھپانے والے لوگ پاگل ہی ہوتے ہیں۔"

انسپکٹر نے اپنے سر کی وگ کو درست کرتے ہوئے کہا۔ "سر! میں آف ٹائم میں تھا۔ ابھی دوسرے انسپکٹر کی ڈیوٹی تھی۔ وہ ابھی تک نہیں آیا ہے۔"

سی۔ ایم۔ او نے پوچھا۔ "جب دوسرا انسپکٹر ڈیوٹی سنبھالنے نہیں آیا تو تمہارا آف ٹائم کیسے ہوگیا؟ اور یہ کیا ضروری ہے کہ میرے استقبال کے لئے وگ پہن کر آؤ؟"

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک ادھیڑ عمر کا آدمی سفید ایپرن پہنے، گلے میں اسٹیتھوسکوپ لگائے تیزی سے چلتا ہوا آیا۔ پھر اس نے بھی اٹینشن ہوکر سلیوٹ کیا اور بولا۔ "میں ڈاکٹر زبیری ہوں۔ ابھی ایک مریض کا معائنہ کررہا تھا۔"

سی۔ ایم۔ او نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمہیں خبر نہیں ملی کہ میں آگیا ہوں اور تمہیں پہلی فرصت میں مجھ سے ملاقات کرنا چاہئے۔"

ڈاکٹر زبیری نے کہا۔ "جی ہاں، جی ہاں، مجھے جیسے ہی آپ کی آمد کی اطلاع ملی، میں مریض کو چھوڑ کر بھاگا چلا آیا۔"

سی۔ ایم۔ او نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "بہت خوب، آفیسر کا استقبال ضروری ہے یا مریض کا معائنہ؟"

وہ بوکھلا کر منہ تکنے لگا۔ وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر ان کے درمیان سے گزرتا ہوا برآمدے میں پہنچا۔ وہاں سے کھڑے ہوکر دور دور تک باغیچے میں نظریں دوڑانے لگا۔ لڑکی نے پوچھا۔ "پاپا! آپ کہتے تھے کہ تمام پاگلوں کو سلاخوں کے پیچھے نہیں رکھا جاتا جو خطرناک نہیں ہوتے، انہیں پاگل خانے کے احاطے میں آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔"

"ہاں بیٹے! ان لوگوں کو دیکھو، کوئی پودوں کو پانی دے رہا ہے۔ کوئی گھاس کاٹ رہا ہے۔ کوئی درخت کے سائے میں کھڑا سوچ میں گم ہے۔ ادھر دو چار لوگ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ یہ سب پاگل ہیں، مگر خطرناک نہیں ہیں۔"

وہ اپنے باپ کے ساتھ اس عمارت کے دوسرے حصے سے گزرنے لگی۔ ان کے آس پاس پاگل خانے کا ڈاکٹر، انسپکٹر انچارج اور دوسرے سپاہی چل رہے تھے اور اپنے

سی۔ ایم۔ او کو وہاں کے متعلق معلومات فراہم کرتے جارہے تھے۔ سی۔ ایم۔ او کی صاحبزادی نوعمر تھی۔ کوئی چودہ یا پندرہ برس کی ہوگی۔ اس میں شوخی اور الھڑپن کے علاوہ ایک ایسی چھپی چھپی سی سنجیدگی تھی جیسے وہ بچپن اور جوانی کے درمیان کھڑی ہچکچا رہی ہو کہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھے یا ابھی اور انتظار کرے۔ اس نے اپنے باپ کے بازو کو پکڑ کر ہولے سے جھنجھوڑتے ہوئے شوخی سے کہا۔ "پاپا! میں ان پاگلوں کو دیکھوں گی جو سلاخوں کے پیچھے رہتے ہیں۔"

"بیٹی! ان میں سے اکثر خطرناک ہوتے ہیں۔ میں تمہیں وہاں لے چلوں گا۔ پہلے اپنا کام کرلوں۔"

"نہیں پاپا! آپ اپنا کام کریں۔ میں اپنا کام کروں گی۔ آخر اتنے سارے سپاہی کس لئے ہیں؟ کیا مجھے کسی پاگل کے حوالے کرکے بھاگ جائیں گے؟"

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم بہت بڑے ڈاکٹر کی بیٹی ہو۔ پاگل تمہیں دیکھتے ہی نارمل ہوجائیں گے۔"

پھر وہ ایک دفتر میں داخل ہوتے ہوئے انسپکٹر سے بولا۔ "میں ابھی ڈاکٹر زبیری کے ساتھ مصروف رہوں گا۔ آپ اس وقت تک میری صاحبزادی کو ذرا پاگل خانے کی سیر کرادیں۔"

وہ خوش ہوکر انسپکٹر اور دو سپاہیوں کے ساتھ جانے لگی۔ سی۔ ایم۔ او نے کہا۔ "خیال رکھئے، یہ سلاخوں کے قریب نہ جانے پائے۔"

انسپکٹر نے ادب سے کہا۔ "جناب! ہم محتاط رہیں گے کسی پاگل کو بے بی کے قریب آنے نہیں دیں گے۔"

وہ بہت خوش تھی جیسے کسی نئی دنیا میں آگئی ہو۔ اس نے اب تک پاگل خانے کے متعلق بہت کچھ سنا تھا۔ کئی بار پاگلوں کو دیکھنے کی ضد کی تھی لیکن ان دنوں ممی اسے ڈانٹ دیا کرتی تھیں۔ "خطرناک لوگوں میں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میں تمہیں کبھی وہاں نہیں جانے دوں گی۔"

پچھلے سال ممی کا انتقال ہوگیا۔ پاپا اس کی ہر ضد پوری کرتے تھے۔ ماں کے مرنے کے بعد وہ اور زیادہ لاڈلی ہوگئی تھی۔ وہ اسے کسی طرح کا صدمہ پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔

اس بار اس نے ضد کی تو وہاں لے آئے۔ پاگل خانے میں سلاخوں کے پیچھے مختلف کوٹھریوں میں طرح طرح کے لوگ نظر آئے۔ کسی کوٹھری میں دو چار پاگل اکٹھے نظر آئے۔ کسی میں کوئی تنہا پاگل نظر آیا۔ کسی کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ کوئی بہت ہی صاف ستھرا نظر آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ابھی شیو بنا کر' نہا دھو کر بالوں میں کنگھی کرنے کے بعد سلاخوں کے سامنے آکر اپنی تصویر کھنچوانے کے لئے کھڑا ہو گیا ہو۔

وہ ایسے ہی ایک نوجوان پاگل کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اس کم عمر نوجوان کی ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ چہرے پر ابھی داڑھی کی فصل نہیں اگی تھی۔ ٹھوڑی پر کہیں کہیں بال نظر آتے تھے۔ چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ معلوم ہوتا تھا' حالات نے اسے وقت سے پہلے بوڑھوں کی طرح سوچنا اور سمجھنا سکھا دیا ہے۔ وہ جیل کی سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے تھامے نظریں اٹھائے خلا میں تک رہا تھا جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہو۔ اس کے اس انداز سے ذہانت کا اظہار ہوتا تھا۔

سی۔ ایم۔ او کی صاحبزادی اتنی سمجھدار نہیں تھی کہ وہ کسی کے انداز سے یا اس کی آنکھوں کی گہرائیوں سے اس کی ذہانت کا پتا چلاتی۔ وہ آج تک صرف اپنے پاپا کی شخصیت سے متاثر ہوتی آئی تھی۔ پاگل نوجوان کی خوبروئی نے بھی اسے متاثر نہیں کیا تھا۔ صرف یہ دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی کہ اتنے سارے پاگلوں میں وہی سب سے زیادہ صاف ستھرا اور سلیقے کا لباس پہنے ہوئے نظر آرہا تھا۔

وہاں کے اسسٹنٹ وارڈن نے کہا۔ "مس صاحبہ! آپ چاہیں تو اس سے باتیں کر سکتی ہیں۔ یہ خطرناک نہیں ہے۔"

وہ ذرا ڈرتے ڈرتے اس کے قریب گئی۔ پھر بھی اتنا فاصلہ رکھا کہ پاگل سلاخوں کے درمیان سے ہاتھ نکال کر اسے پکڑ نہ سکے۔ احتیاطی تدابیر کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔ "اے! تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ چونک گیا۔ سامنے ایک لمبے قد کی دبلی پتلی سی لڑکی نظر آئی پھر وہ لڑکی کو دیکھتا ہی چلا گیا۔ کیونکہ وہ لڑکی آناً فاناً قد نکال رہی تھی۔ اس کا دبلا پتلا جسم ذرا سا بھاری بھرکم ہو رہا تھا' چہرہ بھر گیا تھا۔ وہ مکمل عورت نظر آرہی تھی۔ اس نے سہاگ کا سرخ جوڑا پہن لیا

تھا۔ سر پر گوٹہ کناری کا آنچل' ماتھے پر جھومر اور ناک میں نتھ تھی۔ ہونٹ گلاب جیسے تھے۔ بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل کی دھاری تھی جس نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔

سہاگ کی سیج پر پھولوں کی ملائم پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ماحول معطر معطر ہو رہا تھا۔ پھولوں کی سیج پر وہ مشرقی شرمیلی دلہن گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر وہ آکر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے اس کی ایک انگلی میں انگوٹھی پہناتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ہاں مشرقی رسم و رواج میں کتنی جاذبیت اور کتنی دلکشی ہے۔ اب یہی دیکھو کہ تم میری شریکِ حیات بن چکی ہو لیکن میں تمہارا منہ اس وقت تک نہیں دیکھ سکتا جب تک تم نہیں دکھاؤ گی۔ اس کے لئے بڑی خوبصورتی سے رشوت پیش کرنی پڑتی ہے۔ میں یہ انگوٹھی کی رشوت پیش کر رہا ہوں۔"

وہ حیا سے سمٹنے لگی۔ اس نے گھونگھٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بڑی محبت سے التجا کی۔ "ساحرہ! مجھ سے نہ شرماؤ۔"

دوسرے ہی لمحے خواب کا طلسم ٹوٹ گیا۔ سلاخوں کے باہر کھڑی ہوئی لڑکی ذرا سخت لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ "اے! تم میری صورت کیا دیکھ رہے ہو' میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا؟"

"کیا پوچھا تھا؟" پاگل نوجوان نے کہا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" لڑکی نے سوال دہرایا۔

"اپنا نام تو کوئی بھی شخص بتا سکتا ہے' میں تمہارا نام بتا سکتا ہوں۔ تم ساحرہ ہو' نا؟"

لڑکی ایک دم سے چونک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ پھر حیرانی سے بولی۔ "تمہیں میرا نام کس نے بتایا؟"

"کسی نے نہیں۔ میں تمہیں جانتا ہوں۔" نوجوان پاگل نے کہا۔

"جھوٹ بولتے ہو۔ تم مجھے کیسے جانتے ہو؟ میں آج ہی یہاں آئی ہوں۔"

پھر اس نے انسپکٹر اور اسسٹنٹ وارڈن کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ لوگوں نے اسے میرا نام بتایا ہے؟"

انسپکٹر نے کہا۔ "مس صاحبہ! ہم نے تو آج ہی آپ کو دیکھا ہے۔"

اسسٹنٹ وارڈن نے کہا۔ "ہم نے آج سے پہلے آپ کا ذکر بھی نہیں سنا تھا۔ آپ کے پاپا ایک ہفتہ پہلے اس شہر میں ٹرانسفر ہو کر آئے ہیں۔ ہم ان کے متعلق بھی زیادہ نہیں جانتے۔ پھر آپ کا نام کیسے جان سکتے تھے؟"

"پھر اس پاگل کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟" لڑکی نے پوچھا۔

اس نے سلاخوں کے پیچھے سے کہا۔ "کیا تم میری ایک درخواست قبول کرو گی؟"

"تم نہیں' آپ کہو۔" لڑکی کے لہجے میں سختی تھی۔

"یہی مطالبہ میرا بھی ہے۔ اگر میں آپ کہوں تو آپ کا بھی فرض ہوتا ہے کہ مجھے اسی لہجے میں مخاطب کریں۔ میں عمر میں بڑا ہوں۔"

"میں عمر کا حساب نہیں جانتی۔ اگر تم نہیں جانتے ہو تو سن لو' میں چیف میڈیکل آفیسر کی بیٹی ہوں۔"

"بیٹی خواہ کسی شہنشاہ کی ہو' وہ اپنے شوہر کو آپ سے مخاطب کرتی ہے۔"

ساحرہ نے تقریباً چیختے ہوئے پوچھا۔ "کیا؟ تم نے ابھی کیا کہا؟"

وہ بڑی سنجیدگی سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ساحرہ! کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ تمہاری شادی کس سے ہوگی؟"

"نان سنس' میں اپنے پاپا کو بہت چاہتی ہوں۔ میں اپنے پاپا کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ کسی سے شادی نہیں کروں گی۔ تم یہ سوال کرنے والے کون ہوتے ہو؟"

"اکثر لڑکیاں جو اپنے باپ سے متاثر ہوتی ہیں۔ وہ نوعمری میں یہی سوچتی ہیں کہ اپنے باپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گی۔ پھر ایک دن دلہن بن کر چلی جاتی ہیں اور ایک دن تم بھی دلہن بن کر میری زندگی میں آجاؤ گی۔"

وہ غصے سے دونوں ہاتھ بڑھا کر بولی۔ "میں آج تمہارا منہ نوچ لوں گی۔" وہ آگے بڑھنا چاہتی تھی۔

اسسٹنٹ وارڈن نے اسے پکڑ لیا۔ تب اسے خیال آیا۔ وہ پاگل کا منہ کیا نوچے گی؟ پاگل خود اسے نوچ کھسوٹ ڈالے گا۔ اسسٹنٹ وارڈن نے کہا۔ "مس صاحبہ! یہ خطرناک پاگل نہیں ہے۔ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ تاہم احتیاطاً اس سے دور رہنا چاہئے۔"

وہ غصے سے بولی۔ "تم لوگ سن رہے ہو' یہ کیا کہہ رہا ہے؟"

"پاگل طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ انہیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دینا چاہئے۔"

"میں پاگل نہیں ہوں ساحرہ! میری پیشن گوئی پر یقین نہ کرو لیکن جو ہونے والی بات ہے وہ تو سامنے آئے گی۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

ساحرہ نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ ناگواری زائل ہونے لگی۔ پتا نہیں' اس میں کشش تھی۔ اس کی خوبروئی تھی یا اس کی معصومیت اور گہری سنجیدگی جس نے ساحرہ کو متاثر کیا تھا۔ وہ سوچنے لگی' کیا اسے غصہ دکھائے' اس سے نفرت کرے یا پاگل سمجھ کر معاف کر دے؟ لیکن وہ فقرہ دماغ میں گونج رہا تھا۔ "میں پاگل نہیں ہوں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

وہ وہاں سے پلٹ کر جانے لگی۔ جاتے جاتے پھر اس نے رک کر اسے دیکھا تو اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ اس نے پھر سلاخوں کے پیچھے سے التجا کی۔ "میں اس خوش نصیب لمحے کی قسم کھا کر کہتا ہوں جب تم میرے نام سے اور میری ذات سے مجھے قبول کرو گی۔ میں پاگل نہیں ہوں۔"

زندگی میں پہلی بار ساحرہ کو یوں لگا جیسے اس کے کانوں میں کوئی سحر پھونک رہا ہو۔ کوئی عجیب سی بات کہہ رہا ہو۔ ایسی بات جو قابل قبول نہیں ہے۔ تاہم اس بات میں سُر ہے' سنگیت ہے اور ایک ایسی دلچسپی ہے جو کسی پُراسرار کہانی کی ابتدا میں ہوتی ہے۔ وہ قدرے پُراسرار تھا۔ اب ساحرہ اس کے متعلق دانستہ سوچے یا نہ سوچے لیکن نادانستگی میں انسانی فطرت کے عین مطابق اس پُراسرار کہانی کے انجام تک پہنچنے کے لئے مضطرب رہے گی۔

وہ اس دفتر میں آئی جہاں پاپا سے ملنے کی توقع تھی۔ معلوم ہوا کہ اس کے پاپا' پاگل خانے کے اس حصے کا معائنہ کرنے گئے ہیں جہاں خطرناک قسم کے پاگلوں کو رکھا جاتا ہے۔ وہ اسی دفتر میں بیٹھ گئی حالانکہ پاگلوں کو دیکھنے کے شوق میں آئی تھی۔ اس نے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا پھر بیزاری سے کہا۔ "میں تنہائی چاہتی ہوں۔ پلیز' آپ لوگ کمرے سے باہر چلے جائیں۔"

وہ سب چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد بھی وہ سکون سے بیٹھ نہ سکی۔ اٹھ کر ادھر سے اُدھر ٹہلنے لگی۔ اس پاگل نوجوان کی آواز میں جانے کیسی دھمک تھی کہ اب تک اس کے کان بج رہے تھے۔ ہر لڑکی کی زندگی میں ایسا وقت آتا ہے جب کسی کی آواز کانوں میں گھس کر گونجتے رہنے کے لئے ٹھہر جاتی ہے۔

وہ یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھی کہ ایک پاگل سے متاثر ہوگئی ہے۔ بھلا اتنے بڑے میڈیکل آفیسر کی بیٹی ایک پاگل سے کیسے متاثر ہوسکتی تھی۔ اگر اس کا دماغ متاثر ہو بھی رہا تھا تو اس کا اظہار کیا نہیں جاسکتا تھا کیونکہ یہ سراسر اس کی انا کو ٹھیس پہنچنے والی بات تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس کے پاپا آگئے۔ انہوں نے آتے ہی پوچھا۔ "ہاں بیٹے! بتاؤ کیا دیکھا؟"

"وہ ذرا ناراضگی سے بولی۔ "بس ایک ہی پاگل کو دیکھا۔"

"ایک کیوں؟ یہاں تو بہت سے پاگل ہیں۔"

"میں بہتوں کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ وہ جو ایک ہے بڑا بدتمیز ہے۔"

"کیا اس نے تم سے بدتمیزی کی ؟"

"ہاں۔ کہتا تھا' میں اس کی دلہن بننے والی ہوں۔"

سی۔ ایم۔ او نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "بھئی میں تمہیں پہلے ہی سمجھا چکا تھا۔ یہ پاگل اسی طرح کی اوٹ پٹانگ باتیں کرتے رہتے ہیں۔"

"لیکن پاپا! وہ کسی طرح سے پاگل نظر نہیں آتا ہے۔"

"بہت سے پاگل ایسے ہوتے ہیں جو بظاہر نارمل دکھائی دیتے ہیں۔"

"پھر بھی' ایک بات مجھے پریشان کر رہی ہے۔ اسے میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"کسی نے بتادیا ہوگا۔"

"کس نے بتایا ہوگا؟ کیا میں پہلے یہاں آچکی ہوں؟ آپ بھی آج پہلی بار یہاں آئے ہیں۔ کیا اس سے پہلے میرا ذکر یہاں ہوا ہے؟ کوئی میرا نام جانتا تھا؟"

وہ سوچنے کے انداز میں بولا۔ "ہاں' یہ بات ذرا تعجب خیز ہے۔" اس نے پاگل خانے کے ڈاکٹر سے پوچھا۔ "کیا تم بتا سکتے ہو اسے میری بیٹی کا نام کیسے معلوم ہوا؟"

ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "جناب! یہ محض اتفاق ہوسکتا ہے اس کی زبان سے مس صاحبہ کا نام بس یوں ہی نکل گیا ہوگا۔"

ساحرہ نے کہا۔ "ہرگز نہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ مجھے جانتا ہے پھر میرا نام کیسے منہ سے نکل گیا؟ کیا میں کوئی لاٹری کا ٹکٹ ہوں کہ اتفاقاً ایک پاگل کی زبان سے میرا نام نکل آئے۔"

سی۔ ایم۔ او نے کہا۔ "بے بی! ڈونٹ بی ایکسائیٹڈ۔ میں ابھی اس پاگل کو بلا کر پوچھتا ہوں۔"

پھر اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ "آپ وارڈن کے ساتھ وہاں جائیں اور اسے چیک کریں۔ اگر وہ نارمل ہے تو اسے یہاں لے آئیں۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

ڈاکٹر اور اسسٹنٹ وارڈن وہاں سے چلے گئے۔ ساحرہ نے کہا۔ "پاپا! ہوسکتا ہے کہ اس پاگل نے مجھے پنجاب کے کسی دوسرے اسپتال میں دیکھا ہو۔ وہاں کسی سے میرا نام سنا ہو۔"

اس کے پاپا نے ایک سپاہی سے پوچھا۔ "وہ پاگل یہاں کتنے عرصے سے ہے؟"

"جناب! تقریباً چار برس سے۔"

"اس کا فائل لے کر آؤ۔"

سپاہی چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہاں کا ڈاکٹر' وارڈن' انسپکٹر اور دوسرے سپاہی اس نوجوان پاگل کو لے کر کمرے میں آگئے۔ سی۔ ایم۔ او نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "ادھر سامنے آکر کھڑے ہو جاؤ۔"

وہ میز کے دوسری طرف سی۔ ایم۔ او کے بالکل سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ اس سے پوچھا گیا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "کاشف منیر۔"

سی۔ ایم۔ او اسے گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتا جارہا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"تمہاری تاریخ پیدائش؟"

"میں ۱۵ جون ۱۹۵۰ء میں پیدا ہوا تھا۔"

"اب تمہاری عمر کیا ہے؟"

"آئندہ جون کی پندرہ تاریخ کو اٹھارہ برس کا ہو جاؤں گا۔"

سی۔ ایم۔ او نے پوچھا۔ "ایک درخت پر پچاس پرندے بیٹھے ہیں۔ شکاری نے ایک فائر کیا' چار پرندے گر پڑے' باقی کتنے بچے۔"

کاشف نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ "علم ریاضی کے مطابق چھیالیس پرندے بچ گئے لیکن ایک پاگل کا امتحان مقصود ہے تو یہ سوال ہی احمقانہ ہے کیونکہ شکاری کے ایک فائر سے چار پرندے کبھی نہیں گر سکتے۔ دوسرے یہ کہ ایک ہی فائر کی آواز پر سارے کے سارے پرندے اڑ جائیں گے۔ وہاں گنتی کے لئے کوئی نہیں بچے گا۔"

ساحرہ نے خوش ہو کر تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔ "اوہ پاپا! اس نے کتنا مزیدار جواب دیا ہے۔"

سی۔ ایم۔ او نے مسکرا کر کاشف کو دیکھا۔ پھر ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آرام سے بیٹھ جاؤ۔"

اس نے بیٹھنے سے پہلے انسپکٹر' ڈاکٹر اور وارڈن کی طرف باری باری دیکھا۔ وہ لوگ اسے گھور کر دیکھ رہے تھے۔ اسی وقت وہ سپاہی اس کا فائل لے کر آیا اور اسے سی۔ایم۔او کے سامنے ادب سے رکھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ سی۔ ایم۔ او نے فائل پر ہاتھ رکھا جیسے اسے کھول کر دیکھنا چاہتا ہو۔ کاشف نے پوچھا۔ "جناب! کیا آپ واقعی سنجیدگی اور دیانتداری سے میرے متعلق تحقیقات کرنے آئے ہیں؟"

سی۔ ایم۔ او نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر سوال کیا۔ "تمہارے اس سوال کا مقصد کیا ہے؟ تم مجھے دیانتدار نہیں سمجھتے ہو۔ میں بے ایمان ہوں۔"

"معاف کیجئے گا جناب! یہاں تو اب تک سبھی بے ایمان آئے ہیں۔"

ساحرہ نے غصے سے کہا۔ "اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ تم میرے پاپا کو کیا کہہ رہے ہو؟"

پاگل خانے کے انچارج ڈاکٹر نے کہا۔ "جناب! یہ اس قابل نہیں ہے کہ آپ کے سامنے کھڑا بھی ہو سکے اور آپ اسے بیٹھنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔"

سی۔ ایم۔ او نے کہا۔ "ارے ہاں' میں نے تمہیں بیٹھنے کے لئے کہا تھا۔ تم کھڑے کیوں ہو؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "مجھے جب کسی بڑے آفیسر کے سامنے لایا جاتا ہے اس سے پہلے دھمکیاں دی جاتی ہیں کہ میں نے خود کو نارمل ثابت کرنے کی کوشش کی اور صحیح جوابات دیئے تو بعد میں میری پٹائی ہو گی اور پٹائی ہوتی ہے۔ یہ لوگ موٹے ڈنڈے سے مجھے خوب مارتے ہیں۔ آدمی نہیں سمجھتے' جانور سمجھتے ہیں۔"

اچانک ساحرہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر غصے سے اسٹاف سے پوچھا۔ "اے! تم سب لوگ اسے گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟"

پاگل خانے کے ڈاکٹر نے کہا۔ "مس صاحبہ! یہ ہم پر خواہ مخواہ الزام لگا رہا ہے۔"

انسپکٹر اور وارڈن نے بھی ڈاکٹر کی تائید کی۔ سی۔ ایم۔ او نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "تم سب باہر جاؤ۔ جب تک میں آواز نہ دوں' اندر کوئی نہ آئے۔"

وہ سر جھکا کر وہاں سے جانے لگے۔ جاتے جاتے بھی وہ کن انکھیوں سے کاشف کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے آخری وارننگ دیتے ہوئے جا رہے ہوں۔ ڈاکٹر نے دروازے کے پاس پہنچ کر عاجزی سے کہا۔ "جناب! کبھی کبھی کاشف پر شدید دورہ پڑتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ آپ کو نقصان پہنچائے۔ کسی سپاہی کا یہاں موجود رہنا ضروری ہے۔"

سی۔ ایم۔ او نے اپنے بازو پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "میں اس نوجوان سے زیادہ مضبوط ہوں۔ ایسی کوئی بات ہوئی تو اسے سنبھال لوں گا۔ تم لوگ جاؤ۔"

وہ سب ایک ایک کر کے چلے گئے۔ سی۔ ایم۔ او نے کہا۔ "مسٹر کاشف! دروازے کو اندر سے بند کرو اور یہاں کرسی پر آ کر بیٹھ جاؤ۔"

کاشف نے حکم کی تعمیل کی۔ جب وہ دروازے کو بند کر کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا تو ساحرہ نے کہا۔ "پاپا! سب سے پہلے تو یہ پوچھئے کہ اسے میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"ہاں بھئی' پہلے میری بیٹی کے تجسس کو ختم کرو۔ یہ کیا اسرار ہے' تمہیں اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟ کیا تم کبھی پنجاب میں رہ چکے ہو؟"

"میں کراچی سے باہر کبھی نہیں گیا۔"

"تعجب ہے۔ پھر تمہیں اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟"

کاشف نے ذرا سر گھما کر ساحرہ کو دیکھا۔ پھر اس کے باپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "جناب! جب بھی میں اپنے اندر کی بات کسی کو بتاتا ہوں تو کوئی یقین نہیں کرتا' سب مجھے

پاگل کہنے لگتے ہیں۔"

"تم مجھے بتاؤ' میں یقین کروں گا۔"

"جناب! میری باتیں ناقابلِ یقین ہیں۔ پھر بھی کسی امید کے سہارے آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔ کبھی کبھی میرے اندر سے آواز آنے لگتی ہے۔ کبھی آنکھوں کے سامنے ایسے مناظر آتے ہیں جن کا تعلق نہ تو ماضی سے ہوتا ہے نہ زمانہ حال سے۔ وہ مستقبل کے مناظر ہوتے ہیں۔"

سی۔ ایم۔ او نے کہا۔ "گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم مستقبل کی باتیں پہلے سے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیتے ہو؟"

"جی ہاں۔ یہی بات ہے۔"

سی۔ ایم او نے ہنستے ہوئے کہا۔ "واقعی ناقابلِ یقین بات ہے سن کر بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ مجھے ہنسی نہ آئے لیکن تم اپنی ان باتوں کا ثبوت پیش کرو۔"

"میں ثبوت پیش کر چکا ہوں لیکن مجھ پر طرح طرح کے الزامات عائد کر دیئے جاتے ہیں۔"

"مثلاً کیسے الزامات؟"

وہ ذرا چپ رہا۔ سامنے دیوار کو تکتا رہا۔ پھر اس نے آہستگی سے کہنا شروع کیا۔

"بچپن سے میں یہ دیکھتا آیا ہوں کہ جب بھی کوئی انتہائی خوشی کی بات ہوتی ہے یا کوئی انتہائی صدمہ پیش آنے والا ہوتا ہے تو مجھے پہلے سے ویسا ہی منظر دکھائی دینے لگتا ہے۔ پہلے میں نادان تھا' بچہ تھا' اس لئے ایسے مناظر دیکھنے کے باوجود کسی سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ کہتا بھی تھا تو میری باتوں کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ مثلاً میری امی کو آم بہت پسند ہیں' ابو زیادہ پسندیدگی سے نہیں کھاتے۔ اس لئے کبھی کبھی کچھ آم خرید کر لے آتے ہیں۔ ایک روز میں نے صبح اٹھ کر پوچھا۔ "ابو کہاں ہیں؟"

امی نے کہا۔ "اپنی مل میں گئے ہیں۔"

ابو جانے سے پہلے مجھے پیار کر کے جاتے تھے۔ اس روز میں دیر تک سوتا رہا۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ میں نے تصور میں انہیں دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ بازار سے آم کی دو

ٹوکریاں خرید رہے ہیں۔ انہیں کار کی ڈگی میں رکھ کر گھر کی طرف لا رہے ہیں۔ میں نے صبح ناشتا کرتے وقت امی سے کہا۔ "ابو آج شام کو دو ٹوکریاں بھر کر آم لائیں گے۔"

امی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہارے ابو ہفتے میں ایک آم کھالیں تو بہت ہے۔ کجا یہ کہ وہ دو ٹوکریاں بھر کر آم لائیں گے۔"

"امی! میں نے اپنی آنکھوں سے انہیں آم خریدتے دیکھا ہے۔"

وہ پھر ہنستے ہوئے میرے سر کو سہلاتے ہوئے بولیں۔ "صبح تم دیر تک سوتے رہے ہو۔ خواب میں جو دیکھا ہے' اسی کو بیان کر رہے ہو۔ خیر چپ چاپ ناشتا کرو۔"

میں نے ان سے بحث نہیں کی لیکن شام کو امی نے دیکھا' ابو دو ٹوکریاں بھر کر آم لائے تھے۔ انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ کیا! آپ تو آم پسند نہیں کرتے؟"

"بھئی میں پسند نہیں کرتا لیکن تم تو بہت پسند کرتی ہو۔ تمہارے ساتھ بیٹھ کر کبھی کھا تو لیتا ہوں۔ کل رات تم مجھ سے ناراض تھیں۔ میں نے سوچا آج تمہیں خوش کر دوں۔"

امی خوش ہو گئیں۔ اپنی خوشی میں یہ بھول گئیں کہ میں نے پیش گوئی کی تھی اور میری پیش گوئی کے مطابق ابو آموں کی ٹوکری ڈگی میں رکھ کر لائے تھے جبکہ وہ موسم کے پھل اکثر مل کے ملازموں کے ہاتھ بھیج دیا کرتے تھے۔"

سی۔ ایم۔ او نے کہا۔ "ہو سکتا ہے تمہارے ابو واقعی تمہاری امی کا غصہ دور کرنے اور انہیں خوش کرنے کے لئے وہ آم لائے ہوں اور ڈگی میں رکھ کر لائے تھے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کوئی ضروری بھی نہیں ہے کہ ہر چیز چپراسی یا دوسرے ملازموں کے ہاتھ بھیجی جائے۔ وہ چونکہ تمہاری امی کو خوش کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے خود لے کر آئے تھے۔"

کاشف نے کہا۔ "ایک بار ابو نے ڈیش بورڈ کے خانے میں پانچ ہزار روپے رکھے۔ میں امی کے ساتھ وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ جب ابو نے کار اسٹارٹ کی تو میں نے دیکھا' ڈیش بورڈ کا وہ خانہ خالی ہو گیا ہے۔ میں نے کہا۔ "آپ پیسے یہاں نہ رکھیں' گم ہو جائیں گے۔"

امی نے ڈانٹ کر کہا۔ "زبان سے کبھی اچھی بات بھی نکالا کرو۔"

"ابو نے کہا۔ بھئی میرا بیٹا ہمیشہ اچھی باتیں کرتا ہے۔"

"کیا خاک اچھی باتیں کرتا ہے۔ ابھی چار دن پہلے کی بات ہے' مجھ سے کہہ رہا تھا' آپ کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ میں نے اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ کہاں ٹوٹی ہیں' یہ تو سلامت ہیں۔ کوئی عورت یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ کوئی اس کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹنے کی باتیں کرے بیٹے کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں تھپڑ ماردیتی۔"

"بھئی' نادان ہے۔ تم تو ذرا سی بات پر ناراض ہوجاتی ہو۔"

"ناراض ہونے کی بات ہی ہے۔ اس کے دوسرے ہی دن قالین کے کنارے سے میرا پاؤں الجھ گیا۔ میں لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرائی تو میرے ہاتھ کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ دل دھک سے رہ گیا۔ میں آپ کے لئے فوراً ہی دعائیں مانگنے لگی۔ یہ میرا بیٹا ہے' میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ میں دنیا میں سب سے زیادہ اسے چاہتی ہوں لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ اس کی زبان کالی ہے۔"

ابو نے ایک بنک کے سامنے گاڑی روک دی۔ انہیں بنک میں کچھ کام تھا اور امی لاکر سے زیورات کا ایک سیٹ نکالنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے کار کو لاک کردیا پھر مجھے تاکید کی کہ کار میں چپ چاپ بیٹھا رہوں۔ اندر سے دروازہ کھول کر باہر نہ نکلوں اور نہ ہی کسی کے کہنے پر دروازہ کھولوں۔ میں وہاں بیٹھا رہا۔ وہ چلے گئے۔

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ امی اور ابو مجھے کار کے اندر بٹھا کر کہیں جاتے تھے تو بڑی دیر سے آتے تھے۔ مجھے بالکل ہی بھول جاتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے آئس کریم کی دکان کی طرف دیکھا۔ دو چار بچے اپنے والدین کے ساتھ ٹھنڈی بوتلیں پی رہے تھے' آئس کریم کھا رہے تھے۔ میں نے سوچا' ابھی امی اور ابو کے آنے میں دیر ہے۔ چپ چاپ باہر نکل کر جاؤں گا اور آئس کریم کا کپ خرید کر لے آؤں گا۔ پھر اسے کھا کر کار کے باہر پھینک دوں گا کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ یہ سوچ کر میں نے دروازہ کھولا۔ پھر سامنے ہی فٹ پاتھ پر آئس کریم کی دکان پر پہنچ گیا۔ مجھ سے پہلے دو بچے وہاں موجود تھے۔ ان کے ساتھ ان کے بڑے بھی تھے۔ اس لئے دکاندار ان کی طرف متوجہ تھا' میری طرف اس نے ذرا دیر سے توجہ دی۔ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ میں کتنی دیر میں آئس کریم کا کپ خرید کر کار کی پچھلی سیٹ پر واپس آیا۔ دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر مزے لے لے

کر آئس کریم کھاتا رہا۔ کپ خالی ہونے کے بعد میں نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا' کپ کو باہر پھینکا پھر شیشے چڑھا دیئے۔ دروازے کو اسی طرح لاک کردیا۔ اب امی اور ابو میری چوری نہیں پکڑ سکتے تھے۔

پتا نہیں وہ دونوں کتنی دیر بعد آئے۔ میں نے پچھلی سیٹ سے اٹھ کر آگے جھک کر امی کے لئے دروازہ کھول دیا۔ ان کے ہاتھ میں زیورات کا ایک ڈبا تھا۔ ابو کے ہاتھ میں کاغذات کا ایک بنڈل نظر آرہا تھا۔ انہوں نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا پھر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر دروازے کو بند کرنے کے بعد اس کاغذ کے بنڈل سے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں۔ وہ بنک سے کچھ اور روپے لے کر آئے تھے۔ شاید کسی کو ادا کرنے تھے۔ انہوں نے ان روپوں کو رکھنے کے لئے ڈیش بورڈ کے اس خانے کو کھولا پھر جیسا کہ میں نے تصور میں دیکھا تھا۔ اس کے مطابق وہ خانہ خالی تھا۔

امی اور ابو نے چونک کر پہلے تو اس خانے کو دیکھا' اندر ہاتھ ڈال کر ٹٹولا پھر میری طرف پلٹ کر پوچھا۔ "روپے کہاں گئے؟"

میں نے معصومیت سے جواب دیا۔ "وہ گم ہوگئے۔"

ابو نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "کیسے گم ہوگئے؟"

"میں نہیں جانتا۔ میں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ روپے گم ہوجائیں گے۔"

امی نے غصے سے کہا۔ "بکواس کرتے ہو سچ سچ بتاؤ روپے کہاں ہیں؟"

ابو نے نرمی سے پوچھا۔ "بیٹے! کیا تم کار سے نکل کر کہیں باہر گئے تھے؟"

میں نے ڈیش بورڈ کے خالی خانے کو دیکھا۔ میرے ننھے سے دماغ نے سمجھایا۔ اگر میں باہر جانے کی بات کروں گا تو میری پٹائی ہوگی۔ ابو مجھے مارتے نہیں تھے' صرف ناراض ہوجاتے تھے لیکن امی بڑی بے دردی سے مارتی تھیں۔ میں نے کہا۔ "میں یہیں بیٹھا رہا۔"

امی نے کہا۔ "یہ جھوٹ بولنا سیکھ گیا ہے۔ اس کی عادتیں خراب ہوتی جارہی ہیں۔ میں نے آپ سے ہزار مرتبہ کہا ہے کہ کسی اسٹینڈرڈ کے اسکول میں داخل کرائیں جہاں ڈسپلن ہوتا ہے' بچوں کی اچھی تربیت ہوتی ہے۔ مڈل کلاس اسکول میں آوارہ لڑکے ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ یہ بھی آوارہ ہوتا جارہا ہے۔ یقیناً اس نے روپے نکالے ہیں۔"

"بیگم! بچوں کی نفسیات کا خیال رکھنا چاہئے۔ تمہیں اس طرح براہِ راست اس پر الزام عائد نہیں کرنا چاہئے۔ تم خاموش رہو۔ مجھے میرے پیارے بیٹے سے باتیں کرنے دو۔"

میں باہر نکل کے ان کے پاس آیا مگر سہما ہوا تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر آئس کریم کی دکان پر لے گئے۔ پھر آئس کریم والے سے پوچھا۔ "کیا یہ بچہ یہاں آیا تھا؟"

آئس کریم والے نے پہلے مجھے دیکھا۔ پھر کار کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں' یہ ایک کپ خرید کر لے گیا تھا۔"

ابو نے مجھے گود میں اٹھالیا۔ پھر پیار سے میرے ایک گال کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"بیٹے! جھوٹ بولنا تو بہت بری بات ہے۔"

پھر انہوں نے دکان کے مالک سے پوچھا۔ "کیا میری کار کا دروازہ دیر تک کھلا رہا تھا؟"

"جناب! مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہے۔ میں گاہکوں میں الجھا ہوا تھا۔"

ابو مجھے گود میں لئے چاروں طرف دور دور تک دیکھنے لگے۔ وہ ذرا پریشان تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔ "بیٹے! جو ہونا تھا' سو ہوگیا۔ اب تمہاری امی کو معلوم ہوگا تو وہ تمہاری بڑی پٹائی کریں گی۔ تم جب بڑے ہوگے تو معلوم ہوگا کہ پانچ ہزار روپے بہت ہوتے ہیں۔ یہ نقصان تمہاری امی برداشت نہیں کریں گی۔ آج تم نے ایک جھوٹ بولا ہے' تمہیں بچانے کے لئے میں بھی ایک جھوٹ بولوں گا مگر وعدہ کرو' آئندہ کبھی جھوٹ نہیں بولو گے۔"

میں نے انہیں پیار کرتے ہوئے کہا۔ "ابو! آپ بہت اچھے ہیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

اس روز ابو نے امی سے جھوٹ کہہ دیا کہ میں پچھلی سیٹ سے باہر نہیں نکلا تھا۔ دکاندار اس بات کا گواہ ہے۔ امی حیران تھیں کہ جب کار کے دروازے چاروں طرف سے بند تھے تو روپے کہاں غائب ہوگئے؟

ابو نے کہا۔ "ہاں' یہ بڑے تعجب کی بات ہے۔ ہم سمجھنے کی کوشش کرتے رہیں گے کہ آخر روپے کہاں غائب ہوگئے؟"

انہوں نے کسی طرح امی کو ٹال دیا لیکن امی کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ میری زبان کالی ہے۔"

ساحرہ نے کہا۔ "ویری انٹرسٹنگ' اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ جو تم تصور میں دیکھ لیتے ہو' وہی پیش آتا ہے۔"

"ہاں' لیکن اسے کوئی نہیں مانتا۔ اپنی امی کا خیال تو میں ظاہر کرچکا ہوں۔ میرے ابو نے حالات کا تجزیہ کرلیا کہ صرف میرے کار سے باہر نکل کر جانے اور واپس آنے کے دوران کسی نے وہ پانچ ہزار روپے چرا لئے تھے۔ میری پیش گوئی کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ یوں بھی بچوں کی باتوں کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ بچے نے ایک بات کہہ دی۔ اتفاق سے وہی بات ہوگئی یا یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میری باتوں میں نحوست ہوتی ہے۔ میری زبان کالی ہے۔"

سی۔ ایم۔ او نے کہا۔ "بہرحال میں آگے سننا چاہوں گا۔ اس کے بعد کیا ہوا؟"

کاشف نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "اس کے بعد میں نے اپنی امی اور ابو کے سامنے کوئی پیش گوئی نہیں کی۔ کوئی بات میری سمجھ میں آتی تھی۔ میں بتانا چاہتا تھا کہ آج' کل یا کسی دن کوئی خاص واقعہ پیش آنے والا ہے لیکن میں نے ضبط سے کام لیا۔ جب وہ واقعہ پیش آیا تو مجھے یقین ہوگیا کہ میں جھوٹ نہیں بولتا ہوں' میں پاگل نہیں ہوں۔ میں اپنے منہ میں کالی زبان نہیں رکھتا ہوں جو پیش آنا ہوتا ہے وہ پہلے سے معلوم ہوجاتا ہے۔"

ساحرہ نے پوچھا۔ "کیا تم بتا سکتے ہو کہ ابھی تھوڑی دیر بعد کیا ہونے والا ہے؟"

اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "نہیں' میں نہیں بتا سکتا۔ میں کہہ چکا ہوں' جب کوئی شدید خوشی کا موقع ہوتا ہے یا کوئی صدمہ پیش آنا ہوتا ہے' کوئی فائدے کی بات ہوتی ہے یا کبھی نقصان اٹھانا پڑتا ہے تو ایسی باتیں مجھے پہلے سے معلوم ہوجاتی ہیں۔ آج میری زندگی میں بہت عرصے کے بعد شدید خوشی کا موقع آیا ہے۔ تمہیں دیکھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے کانوں میں کوئی بول رہا ہے اور میری نگاہوں کے سامنے تم دلہن بنی ہوئی ہو۔"

وہ جھینپ کر اپنے باپ سے نظریں چرانے لگی۔ اس کے باپ نے کہا۔ "تعجب ہے' تم میرے سامنے میری بیٹی کے متعلق ایسی بے تکی باتیں کر رہے ہو جو کوئی باپ بھی نہیں

سن سکتا۔"

"میں سچ بات نہیں کہوں گا۔ اپنے نارمل ہونے کا ثبوت نہیں دوں گا تو آپ مجھے پاگل سمجھ کر یہاں سے چلے جائیں گے۔ میرے متعلق مزید تحقیقات نہیں کریں گے۔"

"اچھا' یہ بتاؤ تمہیں میری بیٹی کا نام کیسے معلوم ہوا؟"

کاشف نے کہا۔ "جب آپ کی صاحبزادی میرے سامنے اچانک آئیں تو میں نے انہیں سہاگ کے جوڑے میں دیکھا۔ یہ دلہن بنی ہوئی تھیں اور میرے کانوں میں کسی کی آواز آرہی تھی' کوئی پوچھ رہا تھا۔ کاشف منیر ولد منیر احمد تمہارا نکاح احکام شرعی کے مطابق آنسہ ساحرہ بانو دختر قدیر بیگ کے ساتھ بہ عوض مہر پانچ لاکھ روپے سکہ رائج الوقت پڑھایا جارہا ہے۔ کیا تمہیں قبول ہے؟"

سی۔ ایم۔ او اور ساحرہ دونوں ہی اسے ایک ٹک دیکھ رہے تھے۔ اس نے کہا۔ "میرے کانوں میں جب یہ آواز گونجنے لگی تو میں سمجھ گیا' ایک نہ ایک دن میری شادی آپ کی صاحبزادی سے ہوگی۔"

سی۔ ایم۔ او نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا تم نے پہلے میرا نام سنا تھا؟"

"ہرگز نہیں' میں نے تو آپ کو دیکھا تک نہیں تھا یہاں آپ کا ذکر کبھی نہیں ہوا۔"

"میں حیران ہوں۔ تمہیں میری بیٹی کا اور میرا نام کیسے معلوم ہوگیا؟"

"میں نے کہا نا' قاضی صاحب نے نکاح پڑھانے کے دوران آپ کا اور آپ کی بیٹی کا نام میرے کانوں میں لیا تھا۔"

ساحرہ کے باپ نے ایک گھونسا میز پر مارتے ہوئے کہا۔ "بکواس ہے۔"

دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گیا کیونکہ دروازہ کھول کر انسپکٹر وارڈن اور دوسرے سپاہی چلے آئے تھے۔ "جناب! کیا ہوا؟ ہم پہلے ہی کہتے تھے کہ یہ پاگل آپ کو پریشان کرے گا۔"

سی۔ ایم۔ او نے انہیں گھور کر دیکھا۔ "میں تم لوگوں سے کہہ چکا ہوں جب تک آواز نہ دوں یہاں نہ آنا' ناؤ گیٹ آؤٹ۔"

وہ پھر باہر چلے گئے۔ کاشف نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کو دوبارہ بند کردیا۔ پھر اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ سی۔ ایم۔ او نے نرمی سے کہا۔ "سوری مسٹر کاشف! مجھے غصے

میں نہیں آنا چاہئے مگر میں کیا کروں' اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتا ہوں مگر یہ بھی سمجھتا ہوں کہ میری بیٹی لاکھوں میں ایک ہے۔ کتنے ہی لوگ اس کے رشتے کی بات کریں گے۔ مجھے ناراض نہیں ہونا چاہئے۔"

"جناب! میں وعدہ کرتا ہوں۔ اب ایسی کوئی بات نہیں کروں گا جس سے آپ ناراض ہوجائیں۔"

"ٹھیک ہے' مجھے بتاؤ تم پاگل خانے تک کیسے پہنچے؟"

"ابھی بتاتا ہوں لیکن اس سے پہلے آپ یہ سن لیں کہ آپ کے یہاں سے جاتے ہی یہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔"

"کیا سلوک کریں گے؟"

"یہ ہمیشہ دھمکیاں دیتے ہیں کہ میں کسی آفیسر کے سامنے نارمل ہوکر گفتگو نہ کروں۔ کرتا ہوں تو ڈنڈوں سے میری پٹائی کرتے ہیں۔ اگر کوئی آفیسر مجھ سے متاثر ہوتا ہے اور میرے متعلق سنجیدگی سے تحقیقات کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کے جانے سے پہلے چپ چاپ میرے جسم میں کوئی انجکشن لگاتے ہیں۔ اس کے اثر سے میرے اندر ایسا ہیجان پیدا ہوتا ہے کہ میں بیان نہیں کرسکتا.......... میں تڑپتا ہوں اور دیواروں سے سر ٹکرانے لگتا ہوں' چیخنے لگتا ہوں' سلاخوں کو پکڑ کر جھنجوڑنے لگتا ہوں۔ اب سے ایک برس پہلے ایک آفیسر مجھ سے متاثر ہو رہا تھا۔ جب اس نے میری یہ حالت دیکھی تو اس کا ارادہ بدل گیا۔ وہ مجھ سے مایوس ہوکر چلا گیا۔ اب آپ بتائیں اگر یہاں میری باتوں سے آپ پوری طرح متاثر ہوجائیں' میرے متعلق سنجیدگی سے تحقیقات کرنے کا وعدہ بھی کریں لیکن جاتے جاتے آپ کو یہ خبر ملے کہ سلاخوں کے پیچھے پہنچتے ہی مجھ پر دورہ پڑا ہے اور میں شدید جنون کی حالت میں ہوں۔ آپ اور آپ کی صاحبزادی وہاں آکر دیکھیں اور مجھے واقعی جنون کی حالت میں پائیں تو میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟ کیا کبھی یہ سوچیں گے کہ میرے ساتھ کوئی زیادتی ہو رہی ہے؟"

سی۔ ایم۔ او نے اسے گہری تشویش سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ اگر تمہارے ساتھ ایسا ہوتا ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوسکے گا۔ تم یہ بتاؤ' یہاں تک کیسے پہنچے؟"

وہ چند لمحوں تک سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ "ان دنوں میں دس یا گیارہ برس کا تھا۔ ایک دن اپنی کوٹھی کے لان میں بیٹھا ہوا کسی سوچ میں گم تھا۔ کانوں میں اچانک ہی کانچ کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ پھر میری نگاہوں کے سامنے ایک منظر آیا۔ میں نے امی کو دیکھا۔ ان کی دونوں کلائیاں خالی تھیں۔ دونوں ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں تھیں۔ جو چوڑیاں تھیں' وہ ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔"

ساحرہ نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "یہ بات تم پہلے بھی بتا چکے ہو۔"

"ہاں' میں نے ایک ہاتھ کی چوڑیاں ٹوٹنے کا ذکر کیا تھا۔ اس وقت امی نے مجھے بڑی باتیں سنائی تھیں۔ طرح طرح کے واہمے اور اندیشے ان کے دل میں گھر کر گئے تھے۔ وہ دعائیں مانگتی رہی تھیں۔ بہت عرصے کے بعد میں نے دونوں ہاتھوں کی چوڑیوں کو ٹوٹتے دیکھا تھا۔ اب میں ان سے کچھ کہتا تو وہ مجھے برا بھلا بھی کہتیں اور میری پٹائی بھی کرتیں۔ میرے تمام رشتے داروں میں انہوں نے مشہور کردیا تھا کہ میں کالی زبان والا ہوں اور ایک دن بہت جلد پاگل ہوجاؤں گا۔ اگر میں نے اپنی منحوس باتیں نہ چھوڑیں اور دوسروں کے لئے بھی کالی زبان استعمال کی تو وہ لوگ مجھے پاگل خانے بھیج دیں گے۔

شام کو ابو آئے تو میں نے تنہائی میں موقع پاکر پوچھا۔ "ابو! چوڑیاں ٹوٹنے کی بات سے امی غصے میں کیوں آتی ہیں؟"

ابو نے پوچھا۔ "کیا تمہارے دماغ میں پھر کوئی کیڑا کلبلا رہا ہے؟ مار کھانا چاہتے ہو؟"

"نہیں' اسی لئے تو آپ سے پوچھ رہا ہوں۔ آپ بتائیے نا' چوڑیوں کے ٹوٹنے سے کیا ہوتا ہے۔"

"بیٹے ہوتا تو کچھ نہیں ہے لیکن عورتیں اسے سہاگ کی نشانی بنا کر رکھتی ہیں۔ جب وہ بیوہ ہوجاتی ہیں یعنی ان کے شوہر مرجاتے ہیں تو وہ اپنی دونوں ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ دیتی ہیں۔"

"بالکل' میں نے یہی دیکھا ہے۔ امی کے دونوں ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹ گئی ہیں۔"

انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر مسکرا کر کہا۔ "اِٹ اِز آل نان سنس۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ اپنی امی سے ذکر نہ کرنا۔ ورنہ وہ تمہیں الٹا لٹکا دیں گی۔"

میں نے ذکر نہیں کیا لیکن رات کو امی اور ابو کے درمیان گفتگو کے دوران بات

سے بات نکل گئی ہوگی تو ابو نے ذکر کردیا ہوگا۔ پھر کیا تھا' امی کی رات کی نیند حرام ہوگئی۔ وہ مجھے برا بھلا کہنے اور کوسنے لگیں۔ اسی وقت مجھے مارنے کے لئے میرے کمرے میں آنا چاہتی تھیں لیکن ابو نے روک دیا۔ وہ ساری رات روتی رہیں اور ابو سے کہتی رہیں کہ صبح ہوتے ہی ڈاکٹر کے پاس جاکر میرا پوری طرح چیک اپ کرائیں کہیں کوئی دماغی بیماری تو نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ کچھ روز تک ابو کو گھر سے نکلنے نہیں دیں گی۔ خدانخواستہ کوئی حادثہ پیش نہ آجائے۔ کاشف کی زبان کالی ہے۔ وہ کمبخت جو کہتا ہے وہ ضرور ہوتا ہے۔

ہمارے چچا بشیر احمد اپنی بیوی اور چھ سالہ بچی کے ساتھ ہماری ہی کوٹھی میں رہتے تھے اور ہماری مل میں سپروائزر کا کام کرتے تھے۔ انہیں بھی یہ معلوم تھا کہ کس طرح کار سے روپے غائب ہوگئے تھے اور کس طرح میں منحوس یا نیم پاگل سمجھا جانے لگا ہوں۔ وہ امی کی تائید کرتے تھے اور کہتے تھے۔ "بھابی! لڑکا بگڑتا جارہا ہے۔ آوارہ لڑکوں کی صحبت میں رہ کر فضول خرچ ہوگیا ہے۔ وہ روپے جو گم ہوئے ہیں' یقیناً اس کے آوارہ ساتھی اڑا لے گئے ہیں۔"

دوسرے دن ابو نے امی کی تسلی کے لئے اپنا اور میرا ڈاکٹری معائنہ کرایا۔ بعد میں ڈاکٹر کی مکمل رپورٹ مل گئی۔ انہیں کوئی بیماری نہیں تھی اور میں تو نارمل ہی تھا۔ امی نے کہا۔ "دفتر میں جو کام ہے وہ آپ گھر میں بیٹھ کر کریں۔ جن لوگوں سے ملاقات کرنا ہے انہیں کوٹھی میں بلا کر کاروباری معاملات طے کریں۔"

ابو نے مجھے دیکھ کر کہا۔ "بیٹے! تم نے تو میرے لئے مصیبتیں کھڑی کردی ہیں۔"

بہرحال وہ چار دن تک دفتر نہیں گئے۔ میری امی نے چچا جان سے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اس لڑکے کا کیا علاج کروں؟"

چچا بشیر احمد نے کہا۔ "ایک دن تو اس کا مکمل علاج کرنا ہی ہوگا۔ کسی ماہر نفسیات سے رجوع کریں لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ بچپن سے جو کچھ کہتا آیا ہے اور جو ہوتا آیا ہے' اسے آپ ایک ڈائری میں قلمبند کرتی رہیں تاکہ کسی بھی ماہر نفسیات کو اس کی پوری ہسٹری معلوم ہوسکے۔"

چچا کے مشورے پر امی نے میرے متعلق لکھنا شروع کیا۔ بچپن سے گیارہ برس کی

عمر تک میں نے پانچ موقعوں پر جو کچھ کہا تھا اور جو کچھ پیش آیا تھا اس کے متعلق انہوں نے تفصیل سے لکھا اور اپنا خیال ظاہر کیا کہ مجھ پر کسی کا سایہ ہے۔ میں نیم پاگل ہوں۔
بہر حال پانچویں دن ابو نے اعلان کیا کہ وہ دوسرے دن سے دفتر جایا کریں گے۔

دوسرے دن وہ جانے کے لئے تیار ہوئے۔ امی انہیں چھوڑنے کے لئے باہر کار تک آئیں۔ وہ قدرے پریشان تھیں۔ بار بار ابو کو سمجھا رہی تھیں۔ "خوب حاضر دماغ رہ کر کار ڈرائیو کریں۔ گاڑی زیادہ تیز نہ چلائیں کسی کو اوورٹیک نہ کریں۔"

ابو نے ہنس کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے آج میں پہلی بار کار چلانے جا رہا ہوں۔ بھئی تم نے امام ضامن باندھ دیا ہے۔ جانے کیا کچھ پڑھ کر پھونک چکی ہو۔ اب تو اپنے دل کو مضبوط کرو۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ انشاء اللہ میں شام کو بخیریت واپس آؤں گا۔"

وہ کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔ میں دور ایک زینے پر بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ امی نے مجھے گھور کر دیکھا پھر مجھ سے کچھ کہے بغیر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کوٹھی کے اندر چلی گئیں۔ انہیں کسی طرح قرار نہیں آ رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد انہوں نے دفتر فون کیا۔ ابو نے جواباً کہا۔ "میں خیریت سے ہوں اور دفتر میں کام کر رہا ہوں۔"

ایک گھنٹے بعد امی نے پھر فون کیا۔ ابو نے کہا۔ "بھئی! تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ اب مجھے فون نہ کرنا۔ میں حیدر آباد جا رہا ہوں۔ آدھی رات سے پہلے واپس آجاؤں گا۔"

امی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "آپ حیدر آباد کیوں جا رہے ہیں؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کاروباری معاملات ہیں۔ اب میں تمہیں فون پر تو بتا نہیں سکتا۔ واپس آؤں گا تو تمہارے تمام سوالوں کا جواب دوں گا۔"

امی تھوڑی دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ ابو انہیں اطمینان دلاتے رہے۔ پھر انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔ دن کے ایک بجے امی کو احساس ہوا کہ آج انہوں نے مجھے ناشتے کے لئے بھی نہیں پوچھا تھا۔ وہ فوراً ہی میرے پاس آئیں اور مجھے لپٹا کر رونے لگیں۔ کہنے لگیں۔ "بیٹے! ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ میرا دل بہت کمزور ہے۔ دیکھو تو میں نے تمہیں غصے میں ناشتہ کرنے کے لئے بھی نہیں پوچھا۔ کیا تم نے کچھ کھایا ہے؟"

"نہیں امی! مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"آؤ' میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گی۔"

انہوں نے مجھے اپنے ہاتھوں سے کھلایا۔ جب کھانا ختم ہو گیا تو فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ دوڑتے ہوئے فون کے پاس گئیں پھر ریسیور اٹھا کر سننے لگیں۔ سنتے سنتے اچانک ہی ان کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ کر گر پڑا اور وہ چکرا کر صوفے پر گر پڑیں۔ چچا دوڑتے ہوئے آئے۔ "کیا ہوا بھابی! بھابی کیا ہوا؟"

انہوں نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کرتے ہوئے دوسری طرف کی باتیں سنیں۔ وہ سن رہے تھے اور مجھے گھور کر دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے ریسیور رکھ کر کہا۔ "اس لڑکے کی زبان کالی ہے' بلکہ یہ آسیب زدہ ہے' پاگل ہے؟"

چچی جان نے امی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ "آخر ہوا کیا ہے؟"

"ہونا کیا ہے' بھائی جان ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے ہیں۔"

سی۔ ایم۔ او نے حیرانی سے کہا۔ "اوہ گاڈ! تمہاری آپ بیتی سننے کی حد تک بڑی دلچسپ ہے لیکن یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ تمہارے ابو کی موت کیسے واقع ہوئی تھی؟"

"بعد میں تحقیقات ہوئیں۔ ان کی کار سامنے سے آنے والے فوجی ٹرک سے ٹکرا گئی تھی۔ اگر کوئی دوسری گاڑی والے ہوتے تو ان پر الزام آسکتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ ان فوجیوں کا بیان تھا کہ ابو کی گاڑی بے قابو ہو گئی تھی بعد میں گاڑی کو چیک کرنے سے پتا چلا' ایک پہیئے کے نٹ بولٹ شاید پہلے سے ڈھیلے تھے۔ وہ پہیہ نکلنا ہی چاہتا تھا' اسٹیئرنگ بہک رہا تھا' ایسے میں حادثہ پیش آگیا۔"

سی۔ ایم۔ او نے کہا۔ "اگر تم ان دنوں گیارہ برس کے نہ ہوتے' تمہاری عمر کچھ زیادہ ہوتی تو تم پر الزام آسکتا تھا کہ اس پہیئے کے نٹ بولٹ تم نے ڈھیلے کئے ہیں۔ کیونکہ تم نے ہی ان کی موت کی پیشن گوئی کی تھی۔"

"جناب! عمر کم ہونے سے کیا ہوتا ہے' مجھ پر الزام تو آ ہی گیا۔ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ کیسے آیا۔ ابھی تو آپ میری داستان کو ترتیب سے سنیئے۔"

ساحرہ نے چونک کر کہا۔ "پاپا! ترتیب سے سنانے کی بات پر یاد آیا' آپ نے مجھ سے

کہا تھا کہ ایک پاگل کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اس کی زندگی میں' اس کی سوچ میں' اس کے عمل میں' اس کی باتوں میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی۔ وہ بے ترتیبی سے بولتا ہے اور بے ترتیبی سے عمل کرتا ہے لیکن مسٹر کاشف بڑی ترتیب اور سلیقے سے اپنی ہسٹری سنا رہے ہیں۔"

"ہاں' بیٹی! میں اس بات کو نوٹ کر رہا ہوں۔ ہاں تو میاں کاشف! پھر کیا ہوا!؟"

"پھر ہماری کوٹھی میں ماتم ہونے لگا۔ سب رشتے دار آئے لیکن سب نے مجھے ایسے گھورا جیسے میں نے ہی اپنے باپ کو مار ڈالا ہو کسی نے کھل کر مجھ پر الزام عائد نہیں کیا۔ تحقیقات کے دوران سوالات کئے گئے کہ اس گاڑی کے پہیئے کو کسی نے چیک کیوں نہیں کیا تھا۔ کیا گھر میں ڈرائیور نہیں تھا یا یہ کسی کی سوچی سمجھی سازش ہے؟

ان سوالات کے جواب میں بھی میرے چچا بشیر احمد' میری امی اور دوسرے رشتے داروں نے میرے خلاف کوئی بیان نہیں دیا۔ ہاں' ایک بات ہوئی۔ میری امی ماتم کرتی تھیں اور چیخ چیخ کر کہتی تھیں۔ "اس منحوس کو سامنے نہ لاؤ' میں کبھی اس کا منہ نہیں دیکھوں گی۔ اسے دیکھتے ہی میرا دل ہولنے لگتا ہے۔"

مجھے کوٹھی کے ایک دور افتادہ حصے میں نظر بند کر دیا گیا۔ سختی سے کہا گیا کہ میں اپنی مرضی سے باہر نہیں آسکتا۔ میرے لئے تینوں وقت کھانا پہنچ جایا کرے گا۔ کھیلنے کا وقت ہوگا تو مجھے ایک ملازم باہر لے جائے گا۔ اسکول کے وقت بھی ایک ملازم مجھے لے جایا کرے گا اور واپس لاکر اسی کمرے میں بند کر دے گا۔

جو پولیس آفیسر ابو کی موت کے سلسلے میں تفتیش کر رہا تھا اس نے ایک ہفتے بعد ہمارے یہاں فون کیا۔ اس وقت چچا بشیر احمد میری امی کو ذرا بہلانے اور تازہ ہوا کھلانے کے لئے باہر لے گئے تھے۔ میں امی کی غیر موجودگی میں آزادی سے گھوم سکتا تھا۔ انسپکٹر کا فون ہماری چچی نے ریسیو کیا۔ انسپکٹر پوچھ رہا تھا۔ "میں نے سنا ہے' بیگم منیر احمد اپنے بیٹے سے نفرت کرتی ہیں۔ اس کا نام سنتے ہی ہذیانی انداز میں چیخنے لگتی ہیں۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ اسے کہیں دور کسی کمرے میں بند رکھا جاتا ہے۔ اسے بیگم صاحبہ کے سامنے آنے کی اجازت نہیں ہے۔"

میری چچی نے کہا۔ "میں اس سلسلے میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ اس لئے کہ بیگم منیر

احمد باہر ذرا تازہ ہوا کھانے گئی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد آئیں گی۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "میں شام کو خود آؤں گا اور بیگم صاحبہ سے باتیں کروں گا۔"

امی باہر سے واپس آگئیں' ان کی گاڑی کی آواز سنتے ہی مجھے پھر اسی کمرے میں لے جاکر بند کر دیا گیا۔ انہیں جب معلوم ہوا تو میرے چچا بشیر احمد نے کہا۔ "یہ بڑی غلط بات ہوئی۔ بچے کو حبس بیجا میں رکھنے کا الزام ہم پر آئے گا۔ آپ کو کاشف کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیئے۔"

امی نے چیخ چیخ کر کہا۔ "میں اس کی دشمن نہیں ہوں لیکن وہ میرا دشمن ہے۔ ابھی اس نے میرے شوہر کو چھینا ہے' کل میری زندگی چھین لے گا۔ پولیس آفیسر آئے تو اسے صاف صاف کہہ دینا کہ وہ پاگل ہے' جنونی ہے۔ اس پر کسی کا سایہ ہے۔ وہ انسانوں میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔ اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔"

میں اپنے کمرے میں بند دروازے سے لگا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس وقت میں اپنی امی کے پاس جانے اور ان کے سینے سے لگ کر رونے کے لئے کتنا تڑپ رہا تھا لیکن ان کی نفرت بھری آواز' ان کی چیخ پکار سن کر سہم بھی جاتا تھا۔ میں اکثر دوپہر کو کھانے کے بعد سوجایا کرتا تھا۔ ابو کی موت کے بعد میری نیند اڑ گئی تھی۔ پھر بھی میں نے اس روز پلنگ پر لیٹے لیٹے سونے کی کوشش کی۔ دل ہی دل میں دعا مانگتا رہا کہ امی کے دل میں محبت پیدا ہوجائے اور وہ مجھے منانے کے لئے مجھے پیار کرنے کے لئے میرے کمرے میں آجائیں۔ جب میرے دل میں کوئی شدید خواہش پیدا ہوتی ہے تو ایسے ہی وقت میری آنکھوں کے سامنے مستقبل کا کوئی منظر دکھائی دیتا ہے۔ میری خواہش تھی کہ میں امی کو دیکھوں لیکن کوشش کے باوجود میرے کانوں میں نہ تو کوئی آواز آرہی تھی اور نہ آئندہ پیش آنے والا کوئی واقعہ میری آنکھوں کے سامنے چلتی ہوئی فلم کی طرح نظر آرہا تھا۔ میں اسی کوشش میں تھا کہ دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میرے دل نے کہا۔ امی آرہی ہیں میری دعا قبول ہوچکی ہے۔ میں نے فوراً ہی آنکھیں بند کرلیں تاکہ وہ خود آکر مجھے منائیں۔

دروازہ کھلنے کے بعد پھر بند ہونے کی آواز سنائی دی لیکن کسی کے قدموں کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے دل کو سمجھایا کہ امی بہت آہستہ چل رہی ہیں۔ اس

لئے آہٹ سنائی نہیں دے رہی ہے۔ وہ میرے پاس آرہی ہیں۔ اب آتے ہی میرے سر پر محبت سے ہاتھ پھیریں گی۔ پھر میری پیشانی کو بوسہ دیں گی اور اس کے بعد مجھے گلے سے لگالیں گی میرا دل اندر ہی اندر مچل رہا تھا۔ اچانک کسی نے میرے منہ پر کپڑا ڈال دیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں مگر دکھائی نہیں دیا کیونکہ کسی کے مضبوط ہاتھ میری آنکھوں پر جمے ہوئے تھے اسی وقت میرے بازو میں ہلکی سی چبھن محسوس ہوئی۔ میں نے چیخنا چاہا مگر اب دوسرا ہاتھ میرے منہ پر بھی تھا۔ وہ شاید دو یا تین یا زیادہ تھے کیونکہ سر سے پاؤں تک کسی نہ کسی نے مجھے پکڑ رکھا تھا۔

پھر وہ مجھے اٹھا کر چند قدم کے فاصلے تک گئے۔ اس کے بعد ایک شخص نے میرے منہ پر اور میری آنکھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے' مجھے پیچھے سے جکڑے رہا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دوسروں کے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔ جب وہ آوازیں دور ہوگئیں تو جس شخص نے مجھے پکڑ رکھا تھا' ایک زور کا دھکا دیا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا آگے جاکر گرا۔ میں نے فوراً ہی اپنے منہ پر سے کپڑا ہٹایا۔ پلٹ کر دیکھا تو دروازہ بند ہوچکا تھا۔ میں کمرے میں تنہا تھا کون آیا تھا' کون گیا تھا؟ کس نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا تھا؟ میں کسی کو نہ دیکھ سکا۔

میں نے محسوس کیا کہ مجھے غصہ آرہا ہے۔ میں اٹھ کر دوڑتا ہوا دروازے پر آیا۔ میں نے دروازے کو ایک لات مار دی۔ پھر اپنے ہی زور میں پیچھے گر پڑا۔ پھر میں اٹھا اور دروازے کو گھونسے مارنے لگا۔ میرے اندر ایک عجیب سا ہیجان پیدا ہو رہا تھا۔ میں چیخ رہا تھا۔ چلا رہا تھا اور دروازے کو پیٹ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھیں جل رہی ہیں اور چہرہ بھیگ رہا ہے۔ میں نے اپنی آستین سے منہ کو صاف کیا تو پتا چلا میرے منہ سے جھاگ نکل رہی ہے۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اسپتال کے بستر پر پایا۔ وہاں ایک ملازم موجود تھا۔ میں زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ یہ بتا دوں کہ زندگی میں پہلی بار مجھے وہی انجکشن لگایا گیا تھا جس کے اثر سے ایک طرح کا ہیجان پیدا ہوجاتا ہے' جھنجلاہٹ طاری ہوجاتی ہے۔ غصہ رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے اور پھر میں عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتا ہوں کہ جن کا مجھے کوئی احساس نہیں ہوتا۔ جب ہوش میں آتا ہوں تو خود کو پُرسکون پاتا

ہوں۔"

ساحرہ نے پوچھا۔ "تمہارے بازو میں وہ انجکشن کیوں لگایا گیا تھا؟"

میں اس وقت ٹھیک طرح سمجھ نہیں سکا تھا۔ اب سمجھ سکتا ہوں کہ پولیس آفیسر نے شام کو آنے کے لئے کہا تھا شاید وہ امی سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے نفرت کیوں کرتی ہیں اور میرے نام سے وحشت میں کیوں مبتلا ہوجاتی ہیں اور امی کا بیان یہی ہوتا کہ میں پاگل ہوں یا آسیب زدہ ہوں لہٰذا میرے چچا نے مجھے نیم پاگل ثابت کرنے کے لئے وہ انجکشن لگایا تھا۔"

ساحرہ نے کہا۔ "ذرا ٹھہرو! تمہاری زندگی کا یہ بہت ہی اہم واقعہ ہے۔ یہیں سے تمہاری تباہی کا آغاز ہوتا ہے۔ تمہیں پاگل ثابت کرنے کے لئے ایسے انجکشن لگانے کی ابتدا ہوئی۔ کیا تم پر وقت سے پہلے اتنے اہم واقعے کا انکشاف نہیں ہوا؟"

کاشف نے کہا۔ "میں اپنی یا دوسروں کی زندگی میں پیش آنے والے ہر واقعے کو وقت سے پہلے تصور میں نہیں دیکھ سکتا پتا نہیں قدرت کا یہ کیا راز ہے۔ مجھے ہر بات نہیں معلوم ہوتی۔ کوئی کوئی بات وقت سے پہلے میری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔"

سی۔ ایم۔ او نے کہا۔ "اچھا تو پہلی بار تمہارے وہ ہیجان انگیز انجکشن لگایا گیا اور تمہیں پاگل ثابت کرکے یہاں بھیج دیا گیا؟"

کاشف نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "نہیں' اس وقت مجھے یہاں نہیں بھیجا گیا تھا جس اسپتال میں مجھے ہوش آیا تھا وہاں کے ڈاکٹر نے چار دن کے علاج کے بعد بیان دیا تھا کہ میں دماغی مریض نہیں ہوں بلکہ نفسیاتی مریض ہوں۔ ایک تو باپ کے مرنے کا غم ہے دوسرے ماں سے ملنے والی نفرت نے مجھے مشتعل کردیا تھا اگر میرے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے تو میں نارمل رہوں گا۔"

ساحرہ نے کہا۔ "پاپا! آپ تو ٹیکنیکل سوالات کرتے جارہے ہیں اور یہ حضرت جواب دیتے جارہے ہیں۔ مجھے پیش گوئی سے دلچسپی ہے ان صاحب نے اس کے بعد بھی تو کوئی پیشن گوئی کی ہوگی۔"

کاشف نے کہا۔ "ہاں' کی تھی' میرے چچا بشیر احمد نے رفتہ رفتہ میری امی کو سمجھایا کہ مجھے بالکل نظروں سے دور نہیں کردینا چاہئے اور کبھی کبھی ملاقات کرتے رہنا چاہئے وہ

امی کو سیر و تفریح کے لئے باہر لے جاتے تھے۔ دن رات ان کی خدمت میں یوں لگے رہتے تھے جیسے گھر کے ادنیٰ ملازم ہوں۔ صبح امی کے اٹھنے سے پہلے وہ اٹھ جاتے تھے۔ ان کے لئے چائے ناشتے کا انتظام کرتے تھے۔ دن بھر ان کے ساتھ لگے رہتے تھے امی کبھی تنہائی چاہتیں تو وہ کمرے سے باہر جاکر دوسرے کمرے میں بیٹھ جاتے اور کہہ دیتے کہ جب بھی آواز دوگی میں حاضر ہوجاؤں گا۔ گویا کہ وہ بے دام غلام بنے ہوئے تھے۔ چھ ماہ کے عرصے میں ہی امی کا دل بہل گیا۔ ابو کا غم بڑی حد تک کم ہوگیا وہ ہنسنے بولنے لگیں۔ انہوں نے مجھے بلا کر کہا۔ "دیکھو میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔ آخر تم میرے بیٹے ہو۔ ساری زندگی تمہیں سزا نہیں دے سکتی۔ اس لئے ایک بات کا خیال رکھنا' مجھ سے ہر بات کہنا مگر کوئی منحوس بات زبان سے نہ نکالنا۔ ورنہ میں تمہیں پاگل خانے بھیج دوں گی۔"

بس اس روز سے میں محتاط ہوگیا۔ میں نے اپنے دل میں عہد کرلیا تھا کہ اب میری آنکھوں کے سامنے جو بھی منظر دکھائی دے گا یا جو آواز میرے کانوں میں گونجے گی اس کا ذکر امی کے سامنے نہیں کروں گا اور میں اپنے ارادے پر قائم رہا۔ دو برس بیت گئے۔ اسی دوران کئی طرح کے واقعات وقت سے پہلے میری نگاہوں کے سامنے دکھائی دیئے لیکن میں نے ان کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔

ساحرہ نے پوچھا وہ واقعات کیسے تھے جن کا ذکر تم نے کسی سے نہیں کیا تھا؟"

کاشف نے کہا۔ "اگر میں ان کا ذکر تفصیل سے کروں تو صبح سے شام اور شام سے صبح ہوتی رہے گی۔"

سی۔ ایم۔ او نے کہا۔ "بیٹی! مسٹر کاشف درست کہہ رہے ہیں۔ میں اپنی مصروفیات چھوڑ کر یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ بات اتنی عجیب ہے' اتنی دلچسپ ہے اور اتنی سنگین بھی ہے کہ اگر میں اس کی تہہ میں نہیں پہنچوں گا تو میرا ضمیر ملامت کرے گا۔ للذا مسٹر کاشف کو صرف وہی واقعات سنانے دو جن کا تعلق پاگل خانے تک پہنچنے سے ہے۔"

"اوہ نو' پاپا!" وہ ضد کرنے لگی۔ اس کے پاپا نے کہا۔ "بیٹی! اگر تم ساری باتیں تفصیل سے سننا چاہتی ہو تو میں تمہیں اس کا موقع دوں گا۔ آج نہ سہی' کل آکر سن لینا۔ ہاں' تو مسٹر کاشف! اپنا بیان جاری رکھو۔"

کاشف نے پھر کہنا شروع کیا۔ "میں دو برس تک بڑے ضبط سے کام لیتا رہا۔ جو

واقعات وقت سے پہلے میری آنکھوں کے سامنے آتے رہے۔ میں نے ان کا ذکر کسی سے نہیں کیا لیکن دو برس کے بعد ایک ایسا واقعہ میری آنکھوں کے سامنے آیا کہ میں اسے امی کے سامنے بیان کرنے کے لئے بے چین ہوگیا۔"

ساحرہ نے بے چین ہوکر اپنی کرسی پر سیدھی طرح بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "وہ کون سا واقعہ تھا۔ اوہ میرے خدا! تمہاری سرگزشت کتنی دلچسپ ہے۔"

کاشف نے اسے سنجیدگی سے مسکرا کر دیکھا۔ پھر کہا۔ "میں نے اپنی امی کو سرخ جوڑے میں دیکھا۔ وہ سہاگن بنی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں مہندی رچی ہوئی تھی۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھیں۔"

ساحرہ نے خوش ہوکر کہا۔ "یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے' یہ بات سن کر تمہاری امی کبھی ناراض ہو ہی نہیں سکتی تھیں۔ میں نے ابو سے کئی بار کہا ہے کہ یہ دوسری شادی کرلیں مجھے بڑا شوق ہے ابو کو دولہا بنتے ہوئے دیکھوں۔"

اس کے پاپا نے کچھ جھینپ کر بے بسی سے التجا کی۔ "ساحرہ! پلیز' چپ رہو اسے کچھ کہنے دو۔"

وہ چپ رہی۔ کاشف نے کہا۔ "امی اور چچا بشیر احمد ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ امی نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"امی! میں آپ کا حکم ماننے لگا ہوں۔ آپ جو کہتی ہیں' اس پر عمل کرتا ہوں۔ آپ نے کہا تھا کبھی کوئی منحوس بات زبان سے نہ نکالنا۔ میں نے ایسا پھر کبھی نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا۔"

امی نے خوش ہوکر کہا۔ "شاباش' اچھے بچے اسی طرح بڑوں کی باتیں مانتے ہیں۔"

"لیکن امی! میں کوئی خوشخبری تو سنا سکتا ہوں؟" میری بات سنتے ہی وہ دونوں چونک گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر چچا بشیر احمد نے کہا۔ "میرا خیال ہے وکیل ہمیں جائداد کے سلسلے میں کوئی بہت اچھی خبر سنانے والا ہے اور یہ لڑکا پھر اسی طرح کی پیش گوئی کرنے والا ہے۔"

امی نے کہا۔ "اگر ایسی بات ہے تو کوئی ہرج نہیں ہے۔" پھر انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو بیٹے! اگر واقعی وہ خوشخبری ہے تو ہمیں سناؤ۔"

میں نے کہا۔ "میں نہیں جانتا کہ وکیل صاحب کون سی اچھی خبر سنانے والے ہیں لیکن میں ایسی خبر سناؤں گا جس سے اچھی کوئی دوسری خبر ہو ہی نہیں سکتی۔"

امی نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "اب بتا بھی دو۔"

میں نے دونوں ہاتھ سے تالی بجائی اور خوش ہو کر کہا۔ "امی! آپ دلہن بنیں گی۔"

"کیا؟" امی چیخ پڑیں۔ ایک دم سے پریشان ہو کر پوچھا۔ "یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟"

ایسا کہتے ہوئے انہوں نے چچا بشیر کی طرف دیکھا۔ چچا بھی بوکھلا گئے تھے۔ انہوں نے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "تم گدھے ہو' تمہاری امی بیوہ ہیں۔ ان کی شادی تمہارے ابو سے ہوئی تھی۔ اب یہ کسی سے شادی نہیں کریں گی۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو میں نہیں جانتا کہ بیوہ کی شادی ہوتی ہے یا نہیں لیکن امی دلہن بنیں گی اور شادی کریں گی۔"

امی ایک دم سے اچھل کر کھڑی ہوگئیں۔ پھر میری طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "میں تیری زبان کھینچ لوں گی۔ آئندہ تو کسی کے متعلق پیش گوئی نہیں کرے گا۔"

میں ان سے دور بھاگ کر ایک صوفے کے پیچھے چلا گیا۔ چچا بشیر احمد نے میری امی سے کہا۔ "غصے سے کام نہیں چلے گا۔ اگر یہ بات باہر گئی یا کسی طرح وکیل صاحب کے کانوں تک پہنچی تو تم بھائی صاحب کے کاروبار اور اس کی آمدنی سے محروم ہو جاؤ گی۔"

پھر انہوں نے محبت بھرے لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ "بیٹے کاشف! یہاں آؤ۔ تمہاری امی تمہیں نہیں ماریں گی۔ بھئی تمہارا قصور بھی کیا ہے تمہارے دماغ میں جو بات آئی وہ تم نے کہہ دی۔ آؤ تم بہت اچھے بیٹے ہو۔"

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے اپنے پاس محبت سے بٹھایا۔ پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے یہ بات اور کس کو بتائی ہے؟"

میں نے کہا۔ "کسی کو نہیں۔ میں نے امی سے وعدہ کیا تھا کہ چاہے کیسی ہی بات کیوں نہ ہو' میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔"

"شاباش! تم بہت اچھے بیٹے ہو۔ دیکھو خاص طور پر اپنی چچی کو نہ بتانا اور وکیل صاحب جو ہمارے ہاں آتے ہیں ان کے سامنے تو بالکل ذکر نہ کرنا۔"

"چچا جان! میں وعدہ کرتا ہوں۔ کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔ میں نے آج بھی امی

سے اجازت لینے کے بعد یہ بات کہی تھی۔ آئندہ اجازت ملے گی تب بھی نہیں کہوں گا۔"

امی نے غصے اور نفرت سے کہا۔ "ارے تم کیا نہیں کہو گے۔ تم تو پیٹ کے ہلکے ہو۔ کسی سے بھی کہہ سکتے ہو۔ میں کہتی ہوں بشیر! یہ لڑکا مجھے جینے نہیں دے گا۔ خدا کی پناہ' اِدھر ابھی کوئی بات ہوتی بھی نہیں ہے کہ پہلے ہی اس کی زبان پر آجاتی ہے۔ اس پر آسیب کا سایہ ہے۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔ یہ جب تک یہاں رہے گا میں کبھی سکون سے نہیں رہ سکوں گی۔"

چچا بشیر نے دبی زبان سے ان کے قریب ہو کر کہا۔ "میں اسی لئے کہہ رہا تھا اسے کچھ دنوں کے لئے پاگل خانے بھیج دو' وہاں اس کا علاج ہو گا۔ پاگلوں کے درمیان رہ کر اس کا سارا آسیب اتر جائے گا۔"

"جیسا تم بہتر سمجھتے ہو' کرو مگر اس سے میرا پیچھا چھڑا دو۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ اسے کوئی جانی نقصان نہ پہنچے۔"

"میں نادان نہیں ہوں۔ تمہاری ممتا کو سمجھتا ہوں۔ ہزار نفرت کے باوجود تم اس سے محبت کرتی ہو' یہ تمہارا بیٹا ہے اس کی طرف سے اطمینان رکھو۔ ارے یہ تو ایک بچہ ہے' میرے سامنے زہریلا سانپ بھی ہو تو میں اس کا زہر نکال کر اسے زندہ رکھنا جانتا ہوں۔ تمہارا بیٹا سلامت رہے گا' یہ میرا وعدہ ہے۔"

وہ مجھے مختلف ڈاکٹروں کے پاس لے جانے لگے۔ ڈاکٹروں کے علاوہ ایک ماہر نفسیات نے بھی میرا معائنہ کیا۔ مجھ سے طرح طرح کے سوالات کئے۔ چچا بشیر احمد نے صرف ان ڈاکٹروں اور ماہر نفسیات پر بھروسہ کیا اور انہیں بھاری رقمیں فیس کے طور پر دیں جنہوں نے اپنی رپورٹ میں مجھے نیم پاگل قرار دیا اور یہ لکھا کہ میں کبھی کبھی غصے' جوش یا جنون میں خطرناک حرکتیں کرتا ہوں۔ کوئی بھی چیز اٹھا کر کسی پر پھینکتا ہوں' مارنے کے لئے دوڑتا ہوں۔ یہ صورتِ حال بہت تشویش ناک ہے اگر ابھی باقاعدہ علاج نہ ہوا تو اس کی وحشت اور درندگی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائے گی۔"

سی ایم او نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اس طرح انہوں نے مختلف ڈاکٹروں اور ماہرِ نفسیات سے طبی مشورے حاصل کئے اور تمہیں یہاں بھیج دیا۔"

کاشف نے پھر انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "ابھی نہیں' یہ تو ان کی ابتدائی تیاریاں تھیں'

آگے سنیئے۔ ان دنوں میں تیرہ برس کا تھا میرے بارے میں جب یہ بات پھیلنے لگی کہ میں نیم پاگل یا آسیب زدہ ہوں یا مجھ پر دورہ پڑتا ہے اور میں جنون میں مبتلا ہو کر کسی کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہوں تو میں محتاط ہو گیا۔ میں نے قسم کھائی کہ خواہ کچھ ہو' پیش آنے والے واقعات خواہ کتنے ہی دلچسپ ہوں یا دہشت زدہ کرنے والے ہوں یا بہت زیادہ مسرتیں لانے والے ہوں۔ میں کسی صورت میں زبان نہیں کھولوں گا۔ کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ زیادہ سے زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں گزاروں گا۔ کھیل کود سے پرہیز کروں گا تاکہ دوستوں سے کم سے کم ملاقات ہوا کرے۔ میں نے یہ سب کچھ سوچا اور اس پر عمل بھی کیا۔ اس طرح ایک برس اور بیت گیا۔ اس دوران میں نے اپنی اس پیش گوئی کو درست ثابت ہوتے ہوئے دیکھا۔"

سی ایم او نے پوچھا۔ "کیا تمہاری امی نے شادی کرلی؟ وہ دلہن بن گئیں؟"

"ہاں' میں نے حقیقتاً تو ایسا نہیں دیکھا لیکن اپنے تصور میں انہیں دوبارہ دلہن کے روپ میں دیکھا اور اس بار ان کے دولہا کو بھی ان کے ساتھ دیکھا اور وہ تھے چچا بشیر احمد۔"

سی ایم او نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "تو گویا تمہیں پاگل بنا کر اس کی آڑ میں کوئی بہت بڑا ڈراما کھیلا جارہا ہے۔ اتنی داستان سننے کے بعد میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہارے ابو نے اپنی موت سے پہلے جو وصیت نامہ تیار کیا ہوگا اس کی ایک شق یہ ہوگی کہ تمہاری امی جب تک دوسری شادی نہیں کریں گی اس وقت تک وہ تمہاری سرپرست اور کاروبار کی نگراں رہیں گی۔ اس وصیت نامے کے مطابق دوسری شادی کرنے سے انہیں نقصان پہنچتا ہوگا۔ اس لئے انہوں نے چھپ کر تمہارے چچا سے شادی کی ہے۔ تمہارے چچا بھی شادی شدہ ہیں۔ وہ بھی اس شادی کو ظاہر نہیں کرنا چاہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تم نے پہلی بار اپنی امی کو دلہن بننے کی خوشخبری سنائی تو وہ چراغ پا ہو گئیں اور تمہارے چچا بھی پریشان ہو گئے۔ تمہیں بہلا پھسلا کر انہوں نے تمہاری زبان بند کردی تاکہ یہ بات آئندہ تم کسی کے سامنے نہ کہہ سکو۔"

"جی ہاں' میں نے کبھی کسی کے سامنے ذکر نہیں کیا۔ آپ پہلے صاحب ہیں جن سے اتنے عرصے بعد میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔ پندرہ جون کو میں پورے چودہ برس کا ہونے والا

تھا۔ ابو کی زندگی تک میری سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ امی مجھ سے سہمی رہتی تھیں۔ وہ بھلا میری سالگرہ کیسے مناتیں۔ میں خیال ہی خیال میں اپنی سالگرہ کا کیک کاٹنے لگتا تھا۔ ایسے وقت میں نے تصور میں دیکھا کہ کیک کاٹنے کی چھری میرے ہاتھ میں ہے لیکن میں کسی عورت کے جسم کو کاٹ رہا ہوں اور وہاں سے خون بہتا جارہا ہے۔"

ساحرہ نے دونوں ہاتھوں کو اپنے کانوں پر رکھ لیا۔ "اوہ میرے خدا! یہ کس قدر ہولناک خیال ہے۔"

"میں نے آج تک ایک چیونٹی کو بھی نہیں مارا۔ میں تصور میں یہ منظر دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ میں نے خوب توجہ سے بار بار دیکھنے کی کوشش کی۔ آخر وہ عورت کون ہے لیکن وہ مجھے صاف طور سے نظر نہیں آئی۔ شاید وہاں نیم تاریکی تھی یا منظر دھندلا رہا تھا۔ کوئی ایسی بات تھی کہ میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ اس رات میں سو نہ سکا۔ بستر سے اٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ میں نے پہلی بار اپنے آپ کو اتنی بڑی دنیا میں تنہا پایا۔ کوئی میرا ہمدرد' میرا غم گسار نہیں تھا۔ کسی سے میں اپنے دل کی بات کہہ کر اپنا بوجھ ہلکا نہیں کرسکتا تھا۔ کسی سے مشورہ نہیں لے سکتا تھا۔ کسی سے پوچھ نہیں سکتا تھا کہ جو کچھ نظر آیا ہے' اس کا مطلب کیا ہے۔ مجھے کس طرح آئندہ پیش آنے والے اس واقعے سے بچنا چاہئے؟ صبح اذان کے وقت میں تھک ہار کر بستر پر اوندھے منہ گر پڑا۔ رو رو کر اللہ میاں سے کہنے لگا۔ میرے مالک! مجھے ہر طرح آزمائش میں مبتلا کر لیکن میرے ابو کی طرح مجھے ایک شریف آدمی کی زندگی گزارنے کا موقع دے۔ میرے ہاتھوں سے کسی کا قتل نہ ہو۔ چند لمحوں کے بعد مجھے ذرا سکون ہوا۔ نیند آیا ہی چاہتی تھی میرے دماغ نے کہا۔ میں یہاں رہوں گا تو میرے ساتھ ضرور کوئی سازش ہوگی۔ ابو کی حادثاتی موت پر مجھے شبہے کی نظروں سے دیکھا گیا تھا لیکن اس بار کسی کا قتل ہوا تو مجھے جنونی قاتل ٹھہرایا جائے گا۔ یہ بات دماغ میں آتے ہی میں نے اپنی الماری کھولی۔ میں اپنے جیب خرچ سے چھوٹی چھوٹی رقمیں بچا کر رکھتا تھا۔ انہیں نکال کر گنا تو تقریباً ساڑھے تین ہزار روپے تھے۔ وہ میں نے جیب میں رکھے پھر وہاں سے نکل کر جانے لگا۔ کمرے سے باہر نکلتے ہی چچی سے سامنا ہو گیا۔ انہوں نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا' میں نے صاف ستھرے کپڑے' جوتے'

موزے وغیرہ پہنے ہوئے تھے۔ میرے کاندھے سے ایک تھیلا لٹک رہا تھا۔ انہوں نے پوچھا۔ "یہ صبح سویرے تم کہاں جارہے ہو؟"

میں نے بہانہ کیا۔ "بس یونہی ذرا ٹہلنے کے لئے جارہا ہوں۔"

وہ میرے قریب آکر کاندھے سے تھیلا چھینتے ہوئے بولیں۔ "جھوٹ بول رہے ہو۔ اس میں کیا ہے؟"

میں نے تھیلے کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ "نہیں' یہ میں کسی کو نہیں دکھاؤں گا۔ اس میں میرے کپڑے ہیں' میرے پیسے ہیں مجھے چھوڑ دو۔"

وہ نرم پڑ گئیں۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "بیٹے! اگر تم گھر سے باہر جارہے ہو تو یہ بری بات ہے کہاں بھٹکنے جاؤ گے۔ میرے پاس آؤ۔ میری باتیں سن لو۔ پھر جو تمہاری مرضی ہو وہ کرنا۔"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے آئیں۔ اپنے پاس بٹھایا اور پھر کہا۔ "تم اب بچے نہیں رہے لیکن اتنے بڑے بھی نہیں ہو کہ اس گھر کو جہنم ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو' یا محسوس کر سکو۔ میں یہاں کیسے زندہ ہوں؟ میں جانتی ہوں۔ بیٹے' یہاں تمہارے چچا اور تمہاری امی جو کھیل کھیل رہے ہیں' اسے میں ایک عورت ہو کر برداشت نہیں کر سکتی۔ میں نے کئی بار تمہارے چچا سے لڑائی جھگڑا کیا۔ ان کے اس گھناؤنے کھیل کے خلاف آواز اٹھانے کی دھمکی دی۔ جواباً انہوں نے کہا کہ وہ مجھے کھڑے کھڑے طلاق دے دیں گے۔ بیٹا! وہ بڑے چالباز ہیں۔ طرح طرح کے ہتھکنڈے جانتے ہیں۔ مجھے طلاق دینے کے لئے میرے خلاف جانے کیسے کیسے ثبوت فراہم کریں گے۔ میں سہمی سہمی سی رہتی ہوں۔ خدا جانتا ہے مجھے رب کریم کے بعد یہاں صرف تمہارا آسرا ہے۔ میں ایک ایک دن گن رہی ہوں کہ کب تم بالغ ہوگے؟ کب تمہارے ہاتھوں میں کاروبار آئے گا اور کب ان کا وہ شرمناک ناٹک ختم ہوگا؟ ایسے میں تم گھر چھوڑ کر چلے جاؤ گے تو پھر میں بالکل بے سہارا ہو جاؤں گی اور یہاں جو برائیاں پرورش پا رہی ہیں انہیں کوئی ختم نہ کرسکے گا۔"

میں نے کہا۔ "میں امی کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتا۔ وہ جیسی بھی ہیں' میری امی ہیں۔ میں آپ کو صاف صاف بتا دوں کہ انہوں نے چچا جان سے نکاح کرلیا

ہے۔ وہ باقاعدہ ان کی بیوی ہیں۔ اس لئے آپ ان کے خلاف الزام عائد نہ کریں۔"

چچی جان نے پوچھا۔ "کیا تمہارے سامنے تمہاری امی نے ان سے شادی کی ہے؟"

"میرے سامنے نہیں کی۔ میں نے تصور میں دیکھا ہے۔"

وہ جھنجلا کر بولیں۔ "جہنم میں گیا تمہارا تصور۔ کیا ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق تم خود کو پاگل ثابت کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے سہم کر نفی کے انداز میں سرہلایا۔ پھر کہا۔ "میں اب کچھ نہیں کہوں گا۔"

"تو پھر صاف صاف بتاؤ۔ تم نے اپنی امی کو دلہن بنتے اور شادی ہوتے دیکھا ہے؟"

میں چپ رہا۔ میں نے تصور میں وہ سب کچھ دیکھا تھا اور میرا تصور آئینے کی طرح صاف اور شفاف اور مستقبل کا سچا عکاس ہوتا ہے لیکن اسے کوئی نہیں مانتا تھا لہٰذا میں چپ رہا۔ چچی جان نے مجھے خاموش دیکھ کر پوچھا۔ "کیا اب بھی تمہارے دماغ میں ایسی کوئی بات آئی ہے جو مستقبل میں پیش آنے والی ہو؟"

میں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ مجھے آنکھوں کے سامنے وہی کیک کاٹنے والا چاقو نظر آیا جس سے میں کسی عورت کو قتل کر رہا تھا۔ وہ ایسا دہشت ناک اور خوں رنگ واقعہ تھا کہ میں کسی کو سنانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے انکار میں سرہلا کر کہا۔ "نہیں چچی جان! اب میری آنکھوں کے سامنے کوئی منظر نہیں ابھرتا۔"

"تم کہاں جارہے ہو؟" چچی نے پوچھا۔

"بس میں یونہی صبح سے شام تک باہر رہنا چاہتا ہوں۔ یہاں میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

"مجھے اپنا یہ تھیلا دکھاؤ۔" انہوں نے قدرے تیز آواز میں کہا۔

میں نے تھیلے کو سمیٹ لیا کیونکہ اس میں ساڑھے تین ہزار روپے تھے چچی نے زبردستی تھیلے کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کی۔ پھر ہم دونوں میں چھینا جھپٹی شروع ہوگئی۔ وہ کبھی سمجھا رہی تھیں اور کبھی ڈانٹ رہی تھیں۔ "اگر تم مجھے تھیلے کو نہیں دیکھنے دو گے تو میں شور مچاؤں گی۔ پھر تم یہاں سے نہیں جاسکو گے۔"

آخر میں نے تھیلا ان کے حوالے کردیا۔ جس میں سے انہوں نے ساڑھے تین ہزار روپے نکال کر گنے۔ اس کے بعد پوچھا۔ "اتنی رقم لے کر کہاں جاؤ گے؟ تم صبح سے شام تک تفریح کرنا چاہتے ہو' اس کے لئے پچاس روپے کافی ہیں۔ یہ پچاس روپے رکھو

لیکن پہلے اپنی امی کو اپنے جانے کی اطلاع دو۔"

"امی وغیرہ کو میری کوئی پرواہ نہیں ہے۔ آج کل میں آدھی رات کو بھی آتا ہوں تو کوئی مجھ سے کچھ نہیں پوچھتا۔"

یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا۔ چچی جان نے میری بہت بڑی رقم ہتھیالی تھی۔ میں رقم کے بغیر باہر کچھ عرصہ بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر بھی مجھے امید تھی کہ کسی دوست سے قرض لے کر کچھ روز باہر گزار لوں گا۔

کوٹھی سے نکل آنے کے بعد میرے پیچھے وہاں جو کچھ ہوا وہ ساری باتیں بعد میں مقدمہ چلنے کے دوران مجھے معلوم ہوتی رہیں۔ ہوا یہ تھا کہ چچا جان کہیں چھپ کر میری اور چچی جان کی باتیں سن رہے تھے۔ میرے جانے کے بعد انہوں نے چچی جان کو سمجھایا کہ وہ یہ باتیں تمام رشتے داروں کے سامنے بیان کریں اور ذرا نمک مرچ لگا کر' مثلاً میں پچیس ہزار روپے لے کر گھر سے نکل رہا تھا تو چچی جان نے وہ رقم مجھ سے چھین لی اور کہا۔ یہ شریف لڑکوں کے لچھن نہیں ہیں' اس پر میں مشتعل ہوگیا۔ چچی جان کو گالیاں دینے لگا۔ مار ڈالنے کی دھمکی بھی دی لیکن چچی جان نے وہ رقم واپس نہیں کی۔ بعد میں غصہ سے تلملاتا ہوا چلا گیا۔ چچی جان نے یقیناً چچا جان سے اس کے بدلے ہوئے رویے کی شکایت کی ہوگی اور اس کے اور امی کے متعلق کچھ برا بھلا کہا ہوگا۔ مرد ایسے موقعے پر عورت کو سبز باغ دکھا کر اپنی بات منوانا جانتے ہیں لہٰذا چچا جان نے بھی اپنی باتیں منوالی ہوں گی۔

میں تمام دن اپنے دوست کے ساتھ گھومتا رہا۔ اسی کے گھر کھانا کھایا۔ ان دنوں ہماری کوٹھی ناظم آباد میں تھی اور میرے دوست کا مکان لیاری میں تھا۔ ہم اتنی دور تھے کہ کوئی مجھے وہاں آکر تلاش نہیں کرسکتا تھا۔ اگر کرتا بھی تو ہم چھپنا جانتے تھے۔ ویسے میں یہ تمام باتیں بچگانہ ذہن سے سوچ رہا تھا۔ میرے چچا مجھ سے زیادہ چالاک تھے۔ انہوں نے پہلے ہی میرے پیچھے آدمی لگا رکھے تھے۔ ہم فلم کا آخری شو دیکھ کر آرہے تھے کہ راستے میں چار آدمیوں نے مجھے گھیر لیا۔ ایک نے میرے منہ پر ہاتھ رکھا' دوسرے نے میرے ساتھی کو ایک طمانچہ مارا۔ پھر اسے اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔ وہ سہم کر وہاں سے بھاگتا چلا گیا۔ وہ لوگ مجھے اٹھا کر ایک گاڑی میں لے آئے۔ دھمکی دی کہ شور

مچاؤں گا تو مجھے مار ڈالیں گے۔ سہا ہوا چپ چاپ بیٹھا رہا۔

آگے جا کر انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ لوگ مجھے کہاں لے آئے ہیں۔ گاڑی رکی تو میں ان کے سہارے گاڑی سے باہر آیا۔ ان میں سے دو آدمی مجھے دو طرف سے تھام کر کہیں لے جانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد میں رک گیا۔ ایک نے سرگوشی کی۔ "یہ سیڑھیاں ہیں' سنبھل کر چڑھو۔"

میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ مجھے یاد آیا' میری کوٹھی کے پچھلے حصے میں ایک لوہے کا زینہ ہے جو گردش کرتا ہوا زمین سے دوسری منزل تک جاتا ہے۔ اس زینے کے اوپر سرے پر ایک برآمدہ ہے۔ برآمدے میں جو پہلا کمرہ آتا ہے وہ چچا جان اور چچی جان کا بیڈ روم ہے وہ لوگ میرے اندازے کے مطابق مجھے چچا جان کے کمرے میں لے آئے۔ وہاں بالکل خاموشی تھی۔ کہیں سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ جو لوگ مجھے لے کر آئے تھے وہ بھی خاموش تھے۔ پھر مجھے اپنے بازو میں سوئی کے چبھنے کا احساس ہوا۔ میں کراہنا چاہتا تھا۔ میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا گیا۔ کئی لوگوں نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔

کوئی پچیس تیس سیکنڈ گزر گئے۔ کسی نے آہستگی سے کہا۔ "لو اسے پکڑو۔"

میں نے ہاتھ آگے بڑھایا تو کوئی چیز میرے ہاتھ میں آئی۔ میں نے محسوس کیا۔ وہ چاقو کا دستہ تھا۔ اس وقت میں اپنے دل کو تیزی سے دھڑکتا ہوا محسوس کررہا تھا۔ میرے اندر ایک عجیب سی ہلچل پیدا ہورہی تھی اور یہ ہلچل بڑھتی ہی جارہی تھی۔ اس وقت تک سب نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ صرف ایک پہلوان نما مضبوط آدمی نے مجھے تھام رکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے میری آنکھوں سے پٹی کھولی۔ پھر مجھے آگے دھکیل کر وہاں سے چلا گیا۔ میں جس چیز پر گرا وہ ایک عورت کا جسم تھا' جو خون سے لت پت تھا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا مجھے چچی جان کا چہرہ نظر آیا۔ وہ چاروں شانے چت پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے دل کی جگہ سے ابھی تک خون رس رہا تھا اور وہ چاقو اب میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے چیخ کر کہا۔ "نہیں' نہیں..........."

میں اس سے زیادہ نہ چیخ سکا۔ شاید اس انجکشن کا اثر تھا کہ میرے منہ سے کف نکلنے لگا۔ میں آواز نکالنا چاہتا تھا مگر لرز رہا تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کر دوڑتا ہوا دروازے کے پاس آیا۔ بیڈ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن انہوں نے زینے کے دروازے کو باہر سے

بند کر دیا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ بیڈ روم کا دروازہ باہر سے بند کیا جائے گا تو یہ میرے خلاف سازش سمجھی جائے گی۔ انہوں نے قتل کے اس منصوبے میں کوئی خامی نہیں چھوڑی تھی۔ کاش میں اس وقت ہوش و حواس میں رہتا۔ میں زینے کے بند دروازے سے پلٹ کر پھر دوڑتا ہوا چچی جان کی لاش کے پاس آیا۔ اس وقت تک مجھ میں اتنی سمجھ تھی کہ میں دوڑ رہا ہوں' بھاگ رہا ہوں اور جو کچھ میں وقت سے پہلے دیکھ چکا تھا' وہ بھی میری نظروں کے سامنے آگیا ہے لیکن میں نے ابھی تک چچی جان کے جسم پر قاتلانہ حملہ نہیں کیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔ ایسے ہی وقت میرے مخالفوں کا بیان ہے کہ میں جنون کی حالت میں ان کے جسم پر چاقو سے پے در پے وار کر رہا تھا۔"

اپنی داستان سنانے کے بعد کاشف نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "میں نے جو تصور میں دیکھا تھا' وہ پورا ہوا۔ میں نے یقیناً جوش' جنون اور پاگل پن میں چچی جان کے جسم پر چاقو سے حملے کئے ہوں گے لیکن میں قاتل نہیں ہوں۔"

سی ایم او نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "تمہاری چچی جان تمہارے بیان کے مطابق پہلے سے قتل ہو چکی تھیں۔ تم نے ایک مردہ جسم پر وار کیا تھا اور وہ بھی اس انجکشن کے اثر کے تحت۔ تم اپنی چچی جان کے قاتل نہیں ہو۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "جناب! آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مجھے بے گناہ کہا ہے اور شاید آپ مجھے پاگل بھی نہیں سمجھتے ہیں۔"

"فی الحال نہیں سمجھ رہا ہوں۔ میں تمہارے متعلق مزید تحقیقات کروں گا لیکن میں یک طرفہ بیان سن کر تمہارے بارے میں کسی آخری نتیجے پر نہیں پہنچنا چاہتا۔ تمہاری اس فائل میں کیا لکھا ہوا ہے' یہ پڑھنا بھی ضروری ہے۔"

"بے شک! آپ اس کا مطالعہ کریں لیکن اس فائل میں وہی ہو گا جو یہاں کے ڈاکٹر' انسپکٹر اور وارڈن چاہتے ہیں۔ اس فائل میں عدالتی فیصلے کے علاوہ باقی جو کچھ بھی یہاں کے ڈاکٹر اور دوسرے عہدیداروں نے لکھا ہے وہ محض میرے چچا جان کے احسانات تلے دب کر لکھا ہے یقیناً وہ انہیں بھاری رقوم ادا کرتے رہے ہیں۔"

چیف میڈیکل آفیسر فائل کھول کر اس حصے کو پڑھنے لگا جہاں عدالت کا فیصلہ منسلک

کیا گیا تھا۔ ساحرہ نے کاشف سے پوچھا۔ "تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے؟"

"جب میں یہاں پہنچایا گیا تو اس وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا اور ہر سال اول آتا تھا۔"

سی ایم او نے فائل پر سے نظر ہٹا کر اپنی بیٹی سے کہا۔ "ہیئر از دی پوائنٹ بیٹی! اس پوائنٹ کو یاد رکھنا۔ ایک لڑکا جسے پاگل کہا جاتا ہے جس پر دورہ پڑنے کے ثبوت فراہم کئے جاتے ہیں وہ اس قدر ذہین کیسے ہو سکتا ہے کہ ہر سال' ہر کلاس میں اول آیا کرے۔"

"میں اس پوائنٹ کو یاد رکھوں گی اور بھی بہت سی باتیں میرے دماغ میں ہیں۔ پہلے آپ اس فائل کو اسٹڈی کر لیں۔"

پھر اس نے کاشف سے کہا۔ "سوری' میں نے وہاں سلاخوں کے پیچھے تمہیں پاگل اور اپنے سے کمتر سمجھ کر تمہاری توہین کی تھی۔ آئی ایم سوری۔"

کاشف نے خوش ہو کر کہا۔ "کوئی بات نہیں' مجھے تو اتنی خوشی ہو رہی ہے جیسے واقعی نئی زندگی مل رہی ہو۔ تقریباً چار برس سے یہاں میرا کوئی ہمدرد نہیں آیا۔ آپ لوگوں کو پا کر مجھے یقین ہو رہا ہے کہ میرے دن پھرنے والے ہیں اور مجھے یہاں سے رہائی بھی ملنے والی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد سی ایم او نے کہا۔ "عدالت نے فیصلہ سنایا تھا کہ تم نے ہوش و حواس میں رہ کر اپنی چچی کو قتل نہیں کیا تھا چونکہ انہوں نے تم سے پچیس ہزار روپے چھین کر رکھ لئے تھے اس لئے تم غصے اور انتقام کے جوش میں بھرے ہوئے تھے۔ پھر یہ کہ رات کو تم پر اسی طرح کا دورہ پڑا اور تم جنونی انداز میں ان کے بیڈ روم میں داخل ہوئے اور پے در پے چاقو سے حملہ کر کے انہیں مار ڈالا۔ تمہاری امی اور تمہارے چچا کی طرف سے جو وکیل مقرر کیا گیا تھا اس نے یہ کہہ کر تمہیں سزائے موت سے بچا لیا کہ تم پاگل ہو اور تم پر ایسے جنونی دورے پڑتے ہیں اس کے ثبوت میں بہت سے ڈاکٹروں اور ماہرین نفسیات کے تحریری بیانات پیش کئے گئے تھے۔"

سی ایم او نے فائل کا ایک ورق الٹتے ہوئے کہا۔ "عدالت نے فیصلہ سنایا تھا کہ تمہیں پاگل خانے میں ایک سال تک انڈر آبزرویشن رکھا جائے گا۔ ڈاکٹروں کے ذریعے تمہاری رپورٹ حاصل کی جاتی رہے گی۔ اگر وہ رپورٹ تمہارے حق میں ہوئی کہ تم

واقعی پاگل ہو اور تم پر اکثر جنونی دورے پڑتے ہیں تو تمہارے خلاف مقدمے کو خارج کردیا جائے گا پھر تمہاری والدہ اور دیگر سرپرستوں پر یہ ذمے داری عائد کی جائے گی کہ کسی اچھے دماغی اسپتال میں تمہارا باقاعدہ علاج کرایا جائے اور اس کی رپورٹ باقاعدہ متعلقہ شعبے کو پہنچائی جائے۔ بہرحال عدالت کی طرف سے یہاں بہت سی ہدایات درج ہیں۔ اتنا تو سمجھ میں آگیا کہ چار برس پہلے تمہیں صرف ایک برس کے لئے انڈر آبزرویشن رکھا گیا تھا لیکن مزید تین برس گزار دیئے گئے۔ یقیناً تمہارے خلاف بڑی گہری سازشیں ہورہی ہیں۔“

ساحرہ نے کہا۔ ”پاپا! کاشف کے بیان کے مطابق جب بھی یہاں کوئی بڑا آفیسر آتا ہے تو اسے وہی ہیجان انگیز انجکشن لگادیا جاتا ہے جس سے ہر آنے والا آفیسر یہی رپورٹ لکھ دیتا ہے کہ اس پر دورے پڑتے ہیں اور یہ دوسرے عام لوگوں کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اور رہے گا تو خطرہ بن سکتا ہے۔“

سی ایم او نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ گھنٹی کی آواز گونجتے ہی دروازہ کھلا اور سب کے سب دوڑتے ہوئے اندر آتے چلے گئے۔ افسروں کے علاوہ سپاہیوں کی بھی بھیڑ لگ گئی۔ سی ام او نے انہیں دیکھتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا میں نے ایک گھنٹی بجاکر پورے عملے کو بلایا ہے؟“

پہلے تو وہ سب جھینپ گئے۔ پھر انسپکٹر نے سپاہیوں کو ڈانٹ کر کہا۔ ”باہر جاؤ۔“

وہ لوگ باہر چلے گئے۔ صرف انسپکٹر' وارڈن اور ڈاکٹر رہ گئے۔ سی ایم او نے کہا۔ ”آپ لوگ تشریف رکھیں اور اپنی معلومات اور مشاہدات کے مطابق کاشف کے متعلق مجھے بتائیں۔“

وہ تینوں بیٹھ گئے۔ سی ایم او نے اپنی صاحبزادی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”ساحرہ! کیا یہ نوجوان تمہیں پاگل لگتا ہے؟“

ساحرہ نے کہا۔ ”ہرگز نہیں پاپا!“

”خوب سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ اگر میں کہوں کہ تم اس کی ہوش مندی کا ثبوت دو تو کیا کوئی ثبوت دے سکو گی؟“

”اگر میرے بس میں کوئی ثبوت ہوا تو ضرور پیش کروں گی۔“

”تو بیٹی! ایسا کرو میں یہاں ان افسروں سے ضروری باتیں کررہا ہوں۔ تم کاشف کے ساتھ باہر جاؤ اور پاگل خانے کی سیر کرو لیکن تمہارے اور کاشف کے علاوہ تمہارے آس پاس کسی کو نہیں ہونا چاہئے۔“

وارڈن نے حیرانی سے پوچھا۔ ”جناب! کیا واقعی آپ مس صاحبہ کو کاشف کے ساتھ باہر بھیج رہے ہیں؟“

”ہاں' ابھی میں نے یہی کہا ہے۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے؟“

”جی' میں بھلا کیا اعتراض کرسکتا ہوں لیکن اسے کبھی کبھی دورہ پڑتا ہے۔“

”جب وہ ہیجان انگیز انجکشن نہیں لگایا جائے گا تو دورہ کیسے پڑے گا؟“

وہ تینوں چونک گئے۔ انہوں نے گھور کر کاشف کو دیکھا پھر سی ایم او کی طرف دیکھ کر کچھ کہنا چاہتے تھے کہ وہ درمیان میں بول پڑا۔ ”میری صاحبزادی' کاشف کے ساتھ اسی پاگل خانے کے احاطے میں گھومتی پھرتی رہے گی اور یہی دیکھتی رہے گی کہ کوئی اسے انجکشن لگاتا ہے یا نہیں۔ اگر انجکشن نہیں لگایا گیا تو یہ جنون میں مبتلا نہیں ہوگا۔ اس طرح اس فائل میں کاشف کے متعلق جتنی بھی رپورٹیں ہیں وہ سب غلط ثابت ہوجائیں گی۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”جناب! یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ یہ ابھی مس صاحبہ کے ساتھ کہیں گھومنے پھرنے جائے اور واپسی تک اس پر دورہ ضرور پڑے۔ اس کے جنون میں مبتلا ہونے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ کوئی بھی جذباتی لمحہ یا کوئی ایسا وقت جبکہ اسے کسی بات پر غصہ آجائے تو یہ جنون میں مبتلا ہوسکتا ہے۔“

”اس فائل کی رپورٹ بتائے گی کہ کتنے وقفے سے اس پر جنون طاری ہوتا ہے۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”جی ہاں' اس فائل کے مطابق اسے ہفتے میں ایک بار دورہ ضرور پڑتا ہے۔“

”پچھلا دورہ کب پڑا تھا؟“ سی ایم او نے پوچھا۔

”یہی کوئی چار دن پہلے۔“ جواباً ڈاکٹر نے کہا۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تین دن بعد پھر دورہ پڑے گا۔“

”جی ہاں' آپ کسی وقت بھی یہاں آکر دیکھ لیں۔ یہ آپ کو بدترین اور خطرناک

قسم کا پاگل نظر آئے گا۔ اس نے اب تک جو سنجیدگی سے گفتگو کی ہوگی' اس کا پول کھل جائے گا۔"

سی ایم او نے پوچھا۔ "یعنی تمہارے بیان کے مطابق تین یا چار دن یا زیادہ سے زیادہ چھ دن کے اندر اس پر دورہ پڑ سکتا ہے۔"

انسپکٹر' وارڈن اور ڈاکٹر نے بیک آواز کہا۔ "جی ہاں۔"

"اچھا تو میں چھ دن تک انتظار کروں گا۔ ساحرہ! تم کاشف کے ساتھ باہر نہ جاؤ۔"

ساحرہ نے کہا۔ "لیکن پاپا! چھ دن میں کاشف کے ساتھ جو سلوک کیا جائے گا وہ............"

سی ایم او نے بات کاٹ کر کہا۔ "میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔ ذرا صبر سے کام لو۔"

اس نے بریف کیس کو اٹھا کر اسے میز پر رکھا۔ پھر اسے کھول کر اپنا ایک مخصوص لیٹر پیڈ نکال کر کچھ لکھنے لگا۔ وہ سب خاموش تھے اور اسے بغور دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں اس نے اس لیٹر پیڈ سے ایک صفحہ پھاڑ کر الگ کرتے ہوئے ڈاکٹر' وارڈن اور انسپکٹر کو مخاطب کیا۔ "میں مسٹر کاشف کو اپنے ساتھ لے جارہا ہوں۔"

یہ بات ایسی تھی کہ وہ تینوں ہی چونک اٹھے۔ جیسے ان پر بجلی گر پڑی ہو۔ ایک نے اعتراضاً کہا۔ "لیکن جناب؟"

سی ایم او نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "تم لوگوں کے لیکن کا جواب میری اس تحریر میں ہے۔ میں نے اپنی ذمے داری پر یہ لکھ دیا ہے کہ مسٹر کاشف کو یہاں کی رپورٹ کے مطابق ہر ہفتے دورہ پڑتا ہے۔ میں اس کی پرسنل چیکنگ چاہتا ہوں اس لئے اسے اپنے ساتھ لے جارہا ہوں۔ یہ آج سے پورے ایک ماہ تک میرے آبزرویشن میں رہے گا۔ اس کے مقرر کردہ اوقات کے مطابق اسے پوری طرح چیک کیا جائے گا۔ اگر دورہ نہ پڑا تو اس کے فائل میں منسلک کئے ہوئے بہت سے میڈیکل سرٹیفکیٹ غلط قرار دیئے جائیں گے۔"

وہ تینوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ پھر انسپکٹر نے کہا۔ "جناب! آپ یہاں کے مالک ہیں۔ یقیناً مسٹر کاشف کو لے جاسکتے ہیں لیکن عدالت کے فیصلے کے مطابق کاشف کو

یہاں بھیجا گیا ہے۔ عدالتی کارروائی کے بعد اسے یہاں سے لے جایا جاتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔"

"میں کل کسی وقت ہائی کورٹ کے وکیل کے ذریعے کاشف کو پیرول پر رہا کرنے کی اجازت حاصل کرلوں گا۔ اس اجازت نامے کی ایک کاپی آپ لوگوں تک پہنچ جائے گی۔ کیا اب آپ مطمئن ہیں؟"

وہ بھلا مطمئن کیسے ہوسکتے تھے؟ بے اطمینانی تو اب شروع ہوئی تھی۔ سی ایم او کے حکم پر کاشف کا وہ سامان منگوایا گیا جو پاگل خانے میں رکھا گیا تھا۔ سامان آجانے کے بعد اس نے کاشف کا فائل اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہ فائل بھی میں لے جارہا ہوں۔ اس کاغذ پر میں نے اس کی رسید لکھ دی ہے۔"

سی ایم او کاشف اور ساحرہ کے ساتھ کمرے سے باہر آیا۔ وہ سب لوگ اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ باہر کار کے پاس پہنچتے ہی سپاہیوں نے اس کے لئے کار کے دروازے کھول دیئے۔ ساحرہ نے کہا۔ "پاپا! میں کاشف کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاؤں۔"

"ہاں بیٹی ضرور!" سی ایم او نے کہا۔

وہ دونوں بیٹھ گئے۔ پچھلے دروازے بند کردیئے گئے۔ سی ایم او نے کار میں بیٹھنے سے پہلے اپنے سامنے اور آس پاس کھڑے ہوئے پاگل خانے کے عملے کو دیکھا۔ پھر بڑے ہی ٹھوس لہجے میں کہا۔ "میں یہاں سے کاشف کو اس اعتماد کے ساتھ لے جارہا ہوں کہ یہ پاگل نہیں ہے۔ تم میں سے کچھ لوگوں کے دل و دماغ میں کاشف کے متعلق صحیح معلومات چھپی ہوئی ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو شخص بھی مجھے صحیح معلومات فراہم کرے گا میں اس کا نام کسی پر ظاہر نہیں کروں گا۔ اگر کاشف نے اپنا مقدمہ اپنے حق میں جیت لیا تو میں اس لڑکے کے ذریعے اس مخبر کو بہت بڑا انعام دلاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ کار کو ڈرائیو کرتا ہوا پاگل خانے کے احاطے سے باہر جانے لگا۔ جب اس کی کار نظروں سے اوجھل ہوگئی تو وہ سبھی غصے سے بڑبڑانے لگے' انسپکٹر نے کہا۔ "یہ تو ہماری توقع سے زیادہ چالاک نکلا' جاتے جاتے بھی وار کرگیا۔ ہم میں سے کسی نہ کسی کو لالچ دے کر گیا ہے کہ مخبری کرنے والے کو بہت بڑا انعام دیا جائے گا۔ یقیناً کاشف نے کیس جیت لیا تو کروڑوں کی جائیداد کا وہی مالک ہوگا اور اس سے جتنی بڑی رقم انعام کے

طور پر ملے گی وہ ہم میں سے سب سمجھ سکتے ہیں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "لیکن ہم میں سے کون مخبری کرے گا۔ ہم تینوں ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ ایک کی شکایت کریں گے تو شکایت کرنے والا بھی ملزم ٹھہرایا جائے گا۔"

انسپکٹر نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کو شاید یہ نہیں معلوم کہ تین ملزموں میں سے اگر ایک سرکاری گواہ بن جائے تو اسے چھوٹ دی جاتی ہے کہ اس کی سزا معاف کردی جاتی ہے یا کم کردی جاتی ہے۔"

ایک نے کہا۔ "سی ایم او صاحب نے جاتے جاتے ہم تینوں کے درمیان دراڑ پیدا کردی ہے۔ اب ہم ایک دوسرے کو شبے کی نظروں سے دیکھیں گے۔ جانے ہم میں سے کون غداری کرے؟"

دوسرے نے کہا۔ "دیکھو بھئی' ہم تینوں پہلے سر جوڑ کر فیصلہ کرلیں یا تو ہم تینوں ہی مل کر بشیر احمد کے خلاف بیان دے دیں یا پھر تینوں بشیر احمد کی حمایت میں ڈٹے رہیں۔"

ایک نے کہا۔ "شرط یہ ہے کہ پہلے دونوں طرف کا پلڑا دیکھ لیا جائے۔ بشیر احمد کی پوزیشن مضبوط ہے یا کاشف کی؟ اگر کاشف کو بڑے ذرائع حاصل ہوجاتے ہیں اور بشیر احمد کے خلاف ثبوت بھی فراہم ہو جاتا ہے تو پھر ہم بھی ادھر ہی جھک جائیں گے۔"

دوسرے نے کہا۔ "ہم تینوں کو سر جوڑ کر سوچنے سے پہلے بشیر احمد سے رابطہ قائم کرنا چاہئے۔ پہلے اس کی بات سن لیں' اس کی پوزیشن معلوم کرلیں۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔"

وہ تینوں اس بات پر آمادہ ہوگئے اور اپنے دفتر کے اس کمرے میں پہنچے جہاں ٹیلیفون رکھا ہوا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی انسپکٹر نے ریسیور اٹھایا اور ڈاکٹر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اسسٹنٹ وارڈن' انسپکٹر کے کان کے قریب کان لاکر ریسیور سے چپک گیا۔ وہ سب بشیر احمد سے رابطہ قائم کررہے تھے۔

☆======☆======☆

چیف میڈیکل آفیسر قدیر بیگ تیزی سے کار ڈرائیو کرتا جارہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر ساحرہ اور کاشف بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ کاشف نے کہا۔ "میں ایک طویل عرصے کے بعد باہر کھلی فضا میں سانس لے رہا ہوں' اور قدرتی مناظر دیکھ رہا ہوں۔ جناب! آپ بہت عظیم انسان ہیں' آج آپ نے جس طرح میرا ساتھ دیا ہے' میں اسے کبھی نہیں بھولوں گا۔"

سی ایم او نے کہا۔ "میں نے تمہارے لئے کچھ نہیں کیا ہے البتہ ایک چیف میڈیکل آفیسر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ تم ساحرہ سے گفتگو کرو۔ اس وقت میں تمہارے کیس کے متعلق غور کررہا ہوں۔"

کاشف' ساحرہ سے مخاطب ہوا۔ سی ایم او اپنی سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ سوچ رہا تھا' کیا ایک پاگل اجنبی نوجوان سے پہلی ملاقات میں اس قدر ہمدردی کی جاسکتی ہے؟

اس کی دوسری سوچ نے کہا۔ "ہاں اگر ڈاکٹر فرض شناس ہو اور باضمیر ہو تو پہلی ہی ملاقات میں اس کے کام آسکتا ہے۔"

اس کی ایک سوچ نے کہا۔ "کام آنا اور بات ہے اور اپنے گھر لے جانا اور بات ہے۔ کاشف کو کسی دوسرے دماغی اسپتال میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے اطراف سخت پہرے بٹھائے جاسکتے ہیں تاکہ کوئی اسے ہیجان انگیز انجکشن نہ لگا سکے۔"

قدیر بیگ کے دماغ میں مختلف خیالات گڈمڈ ہورہے تھے بعض حالات میں ایسا ہوتا ہے۔ کسی کے ساتھ نیکی یا ہمدردی کی جائے تو ضمیر پوچھتا ہے' ایسا کیوں کیا جارہا ہے؟ اس کے پیچھے کوئی مقصد پنہاں ہے؟ آخر چیف میڈیکل آفیسر قدیر بیگ نے اعتراف کرلیا دل ہی دل میں کہا۔ "ہاں میری بیٹی ساحرہ کو اس سے اچھا شوہر نہیں مل سکتا۔ لڑکا خوبرو ہے' سمارٹ ہے ذہین بھی ہے۔ باتیں سلیقے سے کرتا ہے۔"

پھر اس کے دماغ میں ایک سوال پیدا ہوا۔ "ایسے لڑکے تو اور بہت سے ہوتے ہیں۔ صرف اس پر نظر کیوں پڑی؟"

قدیر بیگ نے گہری سانس لے کر سوچا۔ "پہلے میں نے اسے ایک عام سا نوجوان سمجھا تھا۔ پھر اس کی باتوں سے اور اس کے فائل سے پتا چلا کہ یہ بہت بڑی ٹیکسٹائل ملز کا مالک ہے۔ اس کی ماں اور اس کے چچا کے ہتھکنڈوں کو ناکام بنادینا ناممکن نہیں ہے۔ اگر کیس جیت لیا گیا تو ساری دولت اور جائیداد کا مالک صرف کاشف ہوگا۔ اسے اپنے تمام رشتے داروں سے نفرت ہوگئی ہے۔ اگر نفرت نہ بھی ہوئی ہو تو وہ اب کسی پر اعتماد نہیں کرے گا۔ ایسے میں تنہا میری بیٹی ساحرہ اس گھر میں راج کرے گی۔ سب کچھ اسی کا ہوگا۔ میں اپنی بیٹی کے لئے ایسے ہی شاندار مستقبل کا خواہشمند تھا اور میں یہ خواہش اب پوری کروں گا۔"

اس نے ایک ٹیلیفون بوتھ کے پاس کار روکی بوتھ میں جاکر انٹیلی جنس کے ایک آفیسر سے رابطہ قائم کیا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی اس نے کہا۔ "صمد بخاری! میں قدیر بیگ بول رہا ہوں۔ اپنی مصروفیات بالائے طاق رکھ کر فوراً میرے بنگلے پر پہنچو' میں بھی وہیں پہنچ رہا ہوں۔"

انٹیلی جنس کا آفیسر صمد بخاری جواباً کچھ کہنا چاہتا تھا' قدیر بیگ نے کہا۔ "دیکھو' انکار نہ کرنا۔ مجھے اس وقت تمہاری سخت ضرورت ہے۔"

دوسری طرف سے صمد بخاری نے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ ابھی آرہا ہوں۔"

وہ پھر اپنی کار میں آکر بیٹھ گیا۔ جب وہ اپنی کوٹھی میں پہنچا تو اس کے دس منٹ بعد نٹیلی جنس کا آفیسر صمد بخاری وہاں پہنچ گیا۔ قدیر بیگ نے کہا۔ "صمد! اس نوجوان سے اس کا نام کاشف منیر ہے۔ ابھی میں اسے پاگل خانے سے لایا ہوں۔ اس کی ہسٹری ی دلچسپ ہے۔ تمہیں یہاں کچھ وقت دے کر توجہ سے سننی ہوگی۔"

"اب تو آہی گیا ہوں۔ چاہے مجھے رات بھر بٹھالو۔"

دیر بیگ نے کہا۔ "بیٹے کاشف! یہاں آرام سے بیٹھو اور جو روداد تم نے ہمیں وہ حرف بہ حرف انہیں سنادو۔"

بخاری نے کہا۔ "ٹھہریئے! کیا اس روداد کا تعلق کسی کرائم سے ہے؟"

"یہی بات ہے' اسی لئے تمہیں بلایا ہے۔" قدیر بیگ نے کہا۔

"پھر تو آپ اپنا ٹیپ ریکارڈر لے آئیں اور مسٹر کاشف کا بیان ریکارڈ کرلیں۔ میں یہاں بیٹھ کر سنتا بھی رہوں گا۔"

تھوڑی دیر بعد ہی ریکارڈنگ کا انتظام ہوگیا۔ کاشف نے پھر اسی طرح اپنی داستان شروع کی پہلے تو صمد بخاری نے کچھ زیادہ توجہ نہیں دی لیکن رفتہ رفتہ وہ کبھی حیرانی سے کبھی دلچسپی سے اسے دیکھنے اور اس کی باتیں سننے لگا۔ داستان کے آدھے حصے میں پہنچ کر اس نے ریکارڈر کو آف کردیا اور کہا۔ "میں ابھی باقی داستان سنتا ہوں اتنا تو معلوم ہوچکا ہے کہ کاشف کی والدہ اور اس کے چچا اس واقعے میں ملوث ہیں۔ ذرا ایک منٹ۔"

وہ قریب رکھے ہوئے فون کے پاس گیا۔ پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے کہا۔ "منیر ٹیکسٹائل ملز کی قائم مقام مالکہ بیگم منیر احمد کا رہائشی پتا نوٹ کرو۔"

یہ کہہ کر اس نے کاشف سے پتا پوچھا۔ پھر اپنے اس آدمی کو وہ پتا نوٹ کرایا۔ اس کے بعد حکم دیا۔ "بیگم صاحبہ اور ان کے دیور بشیر احمد پر کڑی نظر رکھو۔ وہ کہاں جاتے ہیں؟ کس سے ملتے ہیں؟ ان کی مصروفیات کیا ہیں؟ مجھے تمام تفصیل معلوم ہونی چاہئے۔ ان کی نگرانی کے لئے جتنے آدمیوں کی ضرورت ہو' لے جاؤ اور ریسیور شہلا کو دو۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا اور انتظار کرتا رہا۔ شاید دوسری طرف سے شہلا کی آواز سنائی دی۔ اس نے شہلا کو بھی اسی رہائش گاہ کا پتا بتایا پھر کہا۔ "اپنی لیڈیز ٹیم کو ایکشن میں آنے کے لئے کہو۔ بیگم منیر احمد اور ان کے رشتے داروں میں دوسری جو اہم عورتیں ہیں ان سے تمہاری ٹیم کی عورتیں جلد از جلد دوستی کریں گی۔ ان کی مصروفیات کا علم ہونا چاہئے۔ اپنی کچھ عورتوں سے کہنا کہ وہاں کی ملازماؤں سے بھی دوستی کی جائے۔ میں بیگم منیر احمد اور مسٹر بشیر احمد کی دن رات کی مصروفیات کو چیک کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر سی ایم او کے قریب آکر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ "ڈاکٹر! اصل بات یہ ہے کہ ہمیں ہر معاملے میں حاضر دماغ رہنا پڑتا ہے۔ جیسے ہی کاشف کی داستان میں بیگم منیر احمد اور بشیر احمد مشکوک کردار نظر آئے ویسے ہی میں نے سمجھ لیا کہ بشیر احمد پاگل خانے کے اہم عہدیداروں کو کھلاتا پلاتا رہتا ہے۔ اچھی

رقمیں دے کر اپنا الو سیدھا کر رہا ہے۔ یقیناً آپ کے یہاں آتے ہی ان عہدیداروں نے بشیر احمد کو اطلاع دی ہوگی۔ لہٰذا اب بشیر احمد کا بوکھلاہٹ میں مبتلا ہونا لازمی ہے۔ شاید وہ بیگم منیر احمد کو لے کر کاشف تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔"

قدیر بیگ نے کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ مجھے بھی رشوت کے طور پر بہت بڑی رقم ادا کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔"

"نہیں ڈاکٹر! وہ اتنا احمق نہیں ہو سکتا۔ اس نے پاگل خانے کے انسپکٹر وارڈن اور ڈاکٹر کے بیانات سے معلوم کرا لیا ہوگا کہ آپ کتنے سخت اور اصول پرست ہیں۔ اس لئے وہ ایک مشفق چچا کے روپ میں کاشف تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ ہاں تو میاں کاشف! ٹیپ ریکارڈر آن کرو اور اپنا بیان جاری رکھو۔"

ساحرہ نے کہا۔ "انکل! میں آپ لوگوں کے لئے گرما گرم چائے کا انتظام کرتی ہوں۔"

صمد بخاری نے کاشف سے پوچھا۔ "کیوں میاں! تم نے پہلے سے تصور میں دیکھ لیا ہے کہ واقعی ساحرہ ہمارے لئے چائے لائے گی یا نہیں؟"

اس کی بات پر سب کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

☆======☆======☆

مرحوم منیر احمد کی شاندار کوٹھی کے بیڈ روم میں بشیر احمد بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ سامنے ہی ایک بہت بڑے قیمتی آرام دہ پلنگ پر بیگم منیر احمد نیم دراز تھیں۔ بشیر احمد نے پریشان ہو کر کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ اچانک کیا ہو گیا؟"

بیگم نے پوچھا۔ "آخر پریشانی کس بات کی ہے؟ اگر چیف میڈیکل آفیسر میرے بیٹے کو لے گئے ہیں تو اس کا بہتر سے بہتر علاج کرایا جائے گا۔"

"تم بھول رہی ہو جب وہ دماغی طور پر نارمل ہو کر آئے گا تو پھر وہی کالی زبان استعمال کرے گا۔ تمہارے لئے مصیبت بن جائے گا۔"

"نہیں، اب وہ جوان ہو گیا ہے۔ اب اس میں بچپنا نہیں رہا۔ میرا بیٹا ٹھیک ہو جائے گا تو مجھے اور کیا چاہئے؟"

"تمہارا بیٹا ٹھیک ہو جائے گا تو ہم دونوں ٹھیک نہیں رہ سکیں گے۔ کیا اس کے

سامنے یہ بتا سکو گی کہ ہم نے بہت عرصہ پہلے شادی کر لی تھی اور اگر شادی کر لی تھی تو یہ بات قانوناً کیوں چھپا کر رکھی؟ وصیت نامے کے خلاف شادی کرنے کے بعد تم منیر احمد کی دولت پر قبضہ جمائے کیوں بیٹھی رہیں اور اس کے کاروبار سے ہونے والی آمدنی کس لئے خرچ کرتی رہیں؟"

"کیا تم چاہتے ہو کہ میں یہ تمام باتیں چھپانے کے لئے ایک ماں ہو کر اپنے بیٹے کے پاگل پن کی دعائیں مانگتی رہوں؟"

"دعاؤں سے کچھ نہیں ہوتا۔ دوا اچھا بھی کرتی ہے اور برا بھی کرتی ہے جس پاگل خانے میں، میں نے کاشف کو رکھا تھا وہاں وہ آرام سے تھا۔ تم کئی بار وہاں جا کر دیکھتی رہی ہو۔ میں کئی بار سمجھا چکا ہوں کہ اس کا پاگل خانے میں رہنا ہم دونوں کے لئے بہتر ہے۔"

بیگم نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے کاشف تمہارے متعلق درست کہتا ہے۔"

بشیر احمد نے چونک کر پوچھا۔ "کیا درست کہتا ہے؟"

"میں جب بھی اس سے پاگل خانے میں ملنے گئی تو کبھی اسے جنون کی حالت میں چیختے چلاتے پایا۔ کبھی وہ نارمل حالت میں نظر آیا ایسے میں اس نے میرے سامنے گڑگڑا کر التجا کی اور قسمیں کھا کر کہا کہ اسے ہیجان انگیز انجکشن لگایا جاتا ہے اور وہ جنون میں مبتلا ہو جاتا ہے مگر تم مجھے سمجھاتے رہے ہو کہ ڈاکٹر دوائیں دے رہا ہے۔ سوچ سمجھ کر انجکشن لگاتا ہے۔ اس کی بہتری کے لئے سب کچھ ہو رہا ہے اور میں ہمیشہ تمہاری باتوں کو فوقیت دیتی آ رہی ہوں لیکن کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے جیسے تم اسے پاگل بنائے رکھنا چاہتے ہو۔ ابھی تم نے کہا ہے کہ اسے پاگل خانے میں رہنا چاہئے اسی میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔ آخر اس کا مطلب کیا ہوا؟"

"مطلب صاف ہے کاشف مجھے اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ اگر وہ ہوش میں رہے گا' یہاں آئے گا تو مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دے گا۔ مجھے تمہارے شوہر کی حیثیت سے اور اپنے سوتیلے باپ کی حیثیت سے کبھی قبول نہیں کرے گا۔ میں نے تمہیں اپنی شریکِ حیات بنائے رکھنے کے لئے اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔ اسی طرح کسی وقت بھی تمہارے کاشف کو ٹھکانے لگا سکتا تھا لیکن تمہاری محبت نے مجھے ایسا کرنے نہیں دیا۔ جب

میں تمہیں چاہتا ہوں تو تمہاری اولاد کو بھی چاہتا ہوں لیکن تم کبھی کبھی ممتا میں اندھی ہو کر صرف مجھے اپنا دشمن سمجھتی ہو۔"

"نہیں بشیر! اگر تمہیں دشمن سمجھتی تو اس طرح تمہارے اشاروں پر نہ چلتی۔"

"دیکھو بیگم! میں ابھی تو دشمن نہیں ہوں لیکن کسی لمحہ بھی دشمن بن سکتا ہوں۔ تم اچھی طرح سوچ لو کہ تمہیں میری ضرورت ہے یا اپنے بیٹے کی؟ اگر دونوں کی ضرورت ہے تو میرے اشاروں پر چلتی رہو۔ صرف بیٹے کی ضرورت ہے تو مجھے چھوڑ دو لیکن میں اپنے بچاؤ کے لئے کاشف کو نہیں چھوڑوں گا۔ تمہارے کاشف کی زندگی اور ہماری ازدواجی زندگی کی سلامتی اسی میں ہے کہ میں جو کر رہا ہوں وہ کرنے دو اور چپ چاپ تماشا دیکھتی رہو۔"

بیگم نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر کہا۔ "اوہ خدایا! میں تو کہیں کی نہ رہی۔ شوہر مرگیا' بیٹا چھوٹ گیا۔ موجودہ شوہر مجھے دھمکیاں دے رہا ہے۔ میں کیا کروں' میری عقل کام نہیں کر رہی ہے۔"

بشیر احمد نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "عورت کی عقل صرف دولت حاصل کرنے کے لئے کام کرتی ہے تمہیں دولت کا لالچ تھا' تم اپنے مرحوم شوہر کی ساری کمائی سمیٹ کر رکھنا چاہتی تھیں۔ اس لئے تم نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن شادی کئے بغیر رہ بھی نہ سکیں۔"

"ایسا نہ کہو۔ تم نے شیطان بن کر مجھے بہکایا۔ پتا نہیں کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کئے مجھے تو یاد بھی نہیں رہا۔ دراصل میں شوہر سے محروم ہونے کے بعد اپنے آسیب زدہ بیٹے سے بھی مایوس ہوگئی تھی۔ خود کو اتنی بڑی دنیا میں تنہا دیکھ کر گھبرا رہی تھی۔ اپنے لئے کوئی سہارا تلاش کر رہی تھی اور تم بڑی چالاکی سے میرا سہارا بن گئے۔"

"واہ' مجھے چالاک کہہ رہی ہو۔ اگر کبھی ہماری شادی کا بھید کھلے گا اور یہ بات عدالت تک پہنچے گی تو عدالت میں تمہیں چالاک و مکار کہا جائے گا کیونکہ شادی کرنے کے باوجود تم اب تک اپنے شوہر کی دولت حاصل کرنے کے لئے بیوہ بنی ہوئی ہو۔"

وہ غصے سے بولی۔ "یہ مشورہ تم نے دیا تھا۔"

"عدالت میں یہ تسلیم نہیں کیا جاتا کہ عورت کو کس نے مشورہ دیا ہے۔ عورت

اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ نکاح قبول کرتی ہے۔ لہٰذا تم راضی خوشی میرے نکاح میں آئی ہو۔"

"تم ایسے کہہ رہے ہو جیسے کسی بھی معاملے میں تمہاری گردن نہیں پھنسے گی۔"

"تمہارا بیٹا ہر ایک کو یہ بیان دے کر مجھے پھانسنا چاہتا ہے کہ میرے ایماء پر اسے ہیجان انگیز انجکشن لگایا جاتا ہے اور اس طرح اسے پاگل ثابت کیا جاتا ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ میرے کہنے پر وہ انجکشن لگایا جاتا ہے۔"

"کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ تم ہر طرح سے اپنا دامن بچالو گے؟"

"بالکل یقین ہے۔" بشیر احمد نے اعتماد سے کہا۔

"کیا تمہیں اس کا یقین ہے کہ کاشف جو پیش گوئی کرتا ہے' وہ درست ثابت ہوتی ہے؟" بیگم نے پوچھا۔

"ہاں' وہ منحوس جو کہتا ہے وہ آئندہ کسی وقت ضرور پیش آتا ہے۔"

"تو پھر تمہیں اپنی حفاظتی تدابیر پر ناز نہیں کرنا چاہئے۔ تم آئندہ جو کچھ بھی اس کے خلاف کرو گے یا اپنی حفاظت کے لئے کرو گے تو وہ باتیں کاشف کو معلوم ہوسکتی ہیں۔ وہ وقت سے پہلے تمہاری تدابیر کو یا تمہارے منصوبوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے اور اگر اس نے دیکھ لیا تب تمہارے کیا بنے گا؟"

وہ گھبرایا ہوا تھا۔ پریشان ہو کر بیگم کا منہ تک رہا تھا۔ اس کا دل خوف سے دھڑک رہا تھا۔ دماغ میں ایک ہی سوال گونج رہا تھا۔ کیا کاشف اسے آنے والے وقت کے آئینے میں دیکھ رہا ہوگا؟"

☆======☆======☆

کاشف اپنے رب کا شکر ادا کر رہا تھا کیونکہ اللہ میاں چھپر پھاڑ کر خوشیاں دے رہے تھے۔ پہلی خوشی تو یہ تھی کہ پاگل خانے سے مستقل رہائی کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ چیف میڈیکل آفیسر قدیر بیگ اور انٹیلی جنس کے آفیسر صمد بخاری کی مسلسل جدوجہد سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ عنقریب دشمنوں کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیں گے۔ اسے گھریلو زندگی کی خوشیاں بھی ملی تھیں۔ سی ایم او کے مکان میں اسے پورا گھریلو ماحول مل رہا تھا۔ سی ایم او نے کہہ دیا تھا کہ آئندہ وہ اسے انکل کہا کرے یعنی اسے ایک بزرگ کی سرپرستی حاصل ہوگئی تھی لیکن سب سے بڑی اور سب سے اہم خوشی ساحرہ کی محبت تھی جو اسے بن مانگے ہی مل رہی تھی۔

ساحرہ کے بیڈ روم کے ساتھ والا کمرہ اس کے لئے مخصوص کیا گیا تھا اور اس کی پسند کے مطابق اسے آراستہ کیا جا رہا تھا ساحرہ ہر معاملے میں اس کی مرضی اور اس کی پسند کے متعلق پوچھتی تھی۔ "تمہیں کون سا رنگ پسند ہے۔ دیواروں پر کون سا ڈسٹمپر چاہتے ہو۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر کس رنگ کے پردے ہونے چاہئیں؟" وہ خود نئی تراش خراش کے رنگا رنگ لباس پہن کر اس کے سامنے آیا کرتی تھی۔ اسے جو خوشبو پسند ہوتی تھی' وہی اپنے لباس پر اسپرے کرتی تھی۔ کاشف کو اپنی زندگی میں ایسی کوئی ہستی آج تک نہیں ملی تھی جو اس کی پسند اور اس کی مرضی کے مطابق عمل کرتی ہو اور اس کے لئے بنتی سنورتی ہو۔ اس کے بغیر کھاتی نہ ہو۔ اس کے سونے سے پہلے سوتی نہ ہو اور جاگنے سے پہلے جاگ جاتی ہو۔

وہ صاحبِ ہوش و خرد تھا۔ اگر پاگل ہوتا تب بھی ساحرہ کی محبت اسے نارمل بنا دیتی۔

وہاں پہنچنے کے دوسرے دن ہی ساحرہ نے ریسیور اٹھا کر ایک فون اٹینڈ کرتے ہوئے کہا۔ "کاشف! یہ تمہاری امی کا فون ہے۔ کیا تم بات کرنا چاہتے ہو؟"

کاشف نے آکر ریسیور لیا۔ پہلے اپنے انکل سی ایم او کو دیکھا پھر اس نے کہا۔ "ہیلو! آپ کون صاحبہ ہیں؟"

دوسری طرف سے ممتا بھری آواز سنائی دی۔ "بیٹے! میں تمہاری ماں ہوں' تم سے ملنے کے لئے تڑپ رہی ہوں۔"

"میں کیسے یقین کروں کہ آپ میری والدہ ہیں۔"

"بیٹے! میری آواز اور میرے لہجے سے مجھے پہچانو۔"

"جب آپ پاگل خانے مجھ سے ملنے آیا کرتی تھیں اور میں ایک ماں کے سامنے تڑپ تڑپ کر کہتا تھا کہ مجھے ہیجان انگیز انجکشن لگائے جاتے ہیں' آپ انہیں اس ظلم سے روکئے تو آپ کے ساتھ آنے والے چچا صاحب فرماتے تھے' یہاں کے ڈاکٹر اور یہاں کا عملہ میرا دشمن نہیں ہے۔ وہ میرے علاج کے لئے دوائیں دیتے ہیں اور انجکشن لگاتے ہیں۔ تب آپ بیٹے کی بات کو جھوٹ سمجھتی تھیں اور چچا کو اپنا سچا وفادار اور مخلص و ہمدرد سمجھتی رہتی تھیں۔"

"بچپن سے تم ایسی کالی زبان بولتے آئے تھے کہ میں نے تم پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔"

"وہ ماں ہی کیا جو اپنے بیٹے کی زبان کو نہ پہچان سکے۔ جبکہ ہمیشہ میری زبان کی سچائی ثابت ہوتی رہی ہے۔"

"بیٹے! ایک بار مجھ سے ملو۔ میں تم پر بھروسہ کروں گی۔"

"اب آپ مجھ پر کیوں بھروسہ کریں گی؟ کیا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے ایک فرشتہ مل گیا ہے اور میری سچائی کو عدالت میں ثابت کرنے والا ہے۔"

"تم جو کچھ بھی کہہ لو' ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ کسی فرشتے سے بڑھ کر ہوتی ہے۔"

"آپ لفظوں سے نہیں' اپنے عمل سے ثابت کر دیں تو میں مان لوں گا۔"

"تم جس طرح کہو گے میں اپنی ممتا کا ثبوت دوں گی۔"

"کیا آپ سچ کہہ رہی ہیں؟" کاشف نے پوچھا۔

"مجھے آزما کر دیکھ لو۔" ماں نے جواباً کہا۔

"تو پھر آپ یہ ارادہ کر کے میرے پاس آئیے۔ عدالت میں میری حمایت کریں گی

اور چچا کے خلاف بیان دیں گی اور یہ بیان ابھی یہاں آنے پر ریکارڈ کیا جائے گا۔"

دوسری طرف خاموشی چھاگئی۔ کاشف نے چند لمحوں تک انتظار کیا۔ پھر پوچھا۔

"آپ خاموش کیوں ہیں؟"

"بیٹے! تمہارے چچا تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ انہوں نے تمہارے خلاف کچھ نہیں کیا ہے۔ ایک بار مجھ سے ملو' میں ان کی طرف سے صفائی پیش کرنا چاہتی ہوں۔"

امی! دراصل آپ دوسری شادی کر کے پھنس گئی ہیں۔ ایک طرف چچا جان آپ کا سہاگ ہیں' دوسری طرف آپ کی اولاد ہے۔ ایسی اولاد جسے آئندہ آپ پاگل خانے میں نہ سہی کسی کچرے میں پھینک سکتی ہیں۔"

"بیٹے! ایسا نہ کہو۔ تمہاری اہمیت میری نظروں میں کتنی ہے' یہ ایک ماں کا دل جانتا ہے۔"

"اگر ماں کا دل جانتا ہے تو پھر آیئے جس طرح آپ نے ایک ماں ہو کر مجھے پاگل خانے بھیجا تھا اسی طرح ایک بیوی ہو کر اپنے دوسرے شوہر کو جیل بھیجئے' ان کے خلاف ثبوت فراہم کرنا ہمارا کام ہے۔"

اس بار اس کی امی کی آواز سنائی نہیں دی۔ اس کے چچا نے اپنی مخصوص گھن گرج والی آواز کے ساتھ کہا۔ "برخوردار! بہت بول رہے ہو۔ تمہاری امی کی نادانی یہ ہے کہ تمہارے جیسے بچے سے گفتگو کر رہی تھیں جبکہ ہمیں تمہارے نوزائیدہ بزرگوں سے بات کرنی چاہئے تھیں۔ کہاں ہیں وہ ہمارے سی ایم او صاحب؟ میں ذرا ان سے دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

کاشف نے ریسیور سی ایم او کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "انکل! یہ بشیر احمد آپ سے دو باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

سی ایم او اپنی جگہ سے اٹھ کر وہاں آیا پھر آرام سے بیٹھتے ہوئے ریسیور ہاتھ میں لے کر بولا۔ "ہیلو! میں چیف میڈیکل آفیسر قدیر بیگ بول رہا ہوں۔"

"میں کاشف کا چچا بشیر احمد بول رہا ہوں۔ آج صبح میں کاشف کی امی کو لے کر آپ کے بنگلے کے سامنے آیا تھا لیکن پولیس کے آدمی نے ہمیں اندر جانے کا موقع نہیں دیا۔ آخر ہمارا راستہ روکنے کی وجہ؟"

سی ایم او نے کہا۔ "بات اصل میں یہ ہے کہ چار برس پہلے کاشف کو ایک کتے نے کاٹ لیا تھا جس کی وجہ سے بیچارے کو پاگل خانے میں رہنا پڑا' اب میں اسے اپنے پاس لے آیا ہوں۔ یہاں میرے علاوہ شہر کے دو اور تجربہ کار ڈاکٹر اس کا معائنہ کر رہے ہیں اور اپنی رپورٹ تیار کر رہے ہیں۔ ایک ماہ تک یہ انڈر آبزرویشن رہے گا۔ اس سے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ڈر ہے کہ وہ چار سال والا کتا آکر کہیں پھر اسے نہ کاٹ لے۔"

"ڈاکٹر! آپ کتا کسے کہہ رہے ہیں؟" بشیر احمد نے پوچھا۔

"کاٹنے والے کو کہہ رہا ہوں۔" سی ایم او نے سنجیدگی سے کہا۔

کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی پھر بشیر احمد نے کہا۔ "آپ سب کو وہاں آنے سے روک سکتے ہیں لیکن ایک ماں کو بیٹے سے ملنے سے نہیں روک سکتے۔"

"میاں بشیر احمد! شاید آپ نے کسی اچھے وکیل سے مشورہ نہیں لیا ہے ورنہ وہ آپ کو بتاتا کہ بعض مریض متعدی امراض کے سبب قرنطینہ میں رکھے جاتے ہیں۔ جہاں ایک ماں کو بھی اپنے بیٹے سے ملنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اگر کوئی پاگل قابل علاج ہو اور کسی کریمنل کیس میں بنیادی اہمیت کا حامل ہو تو کیس کے فیصلے تک خون کے رشتوں کو بھی اس پاگل سے ملنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ آپ اور کچھ پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"جی' میں آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے گھر میں نہ سہی' کسی اور جگہ مل کر آپ کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔"

"اگر مسلسل چار ہفتوں تک کاشف پر پاگل پن کا دورہ نہ پڑا تو میری غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ آپ اپنی خوش فہمی دور کرنے کی کوشش کریں۔"

"ڈاکٹر صاحب! آپ کی باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ آپ مجھے کاشف کا دشمن سمجھ رہے ہیں۔"

"میں نہیں سمجھ رہا ہوں' یہ کاشف سمجھ رہا ہے اور کیسے سمجھ رہا ہے؟ یہ آپ اسی کی زبان سے سنئے۔ ادھر آؤ کاشف بیٹے! تمہارے چچا بشیر احمد تم سے کچھ سننا چاہتے ہیں۔"

کاشف نے آکر ریسیور لیا۔ پھر کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو! آپ لوگوں کے لئے میری

کالی زبان نئی نہیں ہے۔ اب اس زبان سے کچھ کہوں گا تو آپ لوگوں کی بھوک مرجائے گی' نیند اڑ جائے گی۔ لہٰذا اتنا ہی کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ میں نے آپ کو آپ کے مستقبل کے آئینے میں دیکھ لیا ہے۔ بڑی اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ سی ایم او قدیر بیگ نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔ "بھئی کمال ہوگیا۔ تم نے اس بیچارے کو بتایا ہی نہیں کہ اس کے مستقبل کے آئینے میں کیا دیکھا ہے؟ اب تو تجسّس کے مارے اس کا دم گھٹنے لگے گا۔ اسے کسی کل قرار نہیں آئے گا۔"

ساحرہ نے کہا۔ "کاشف! تم نے اسے کیوں نہیں بتایا کہ تم نے اس کے مستقبل کے آئینے میں کیا دیکھا ہے۔"

"میں نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ وہ تو میں نے اسے پریشان کرنے کے لئے کہا ہے۔"

سی ایم او نے کہا۔ "بھئی تمہاری پیش گوئی کرنے کا کوئی وقت تو مقرر ہوگا۔ کسی خاص وقت کوئی بات تمہارے دل میں اترتی ہوگی؟"

"انکل! کوئی خاص وقت مقرر نہیں ہے۔ کبھی ہفتے کبھی دو ہفتے' کبھی ایک مہینے میں کبھی ایک سال میں کوئی تصور آنکھوں کے سامنے قائم ہوتا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ کسی خاص ماحول میں تم پر کوئی خاص کیفیت طاری ہوتی ہے۔"

"میں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا۔"

"تم اب تک نادان تھے۔ ایک تو کم عمر رہے پھر پاگل خانے میں اپنے مزاج کے خلاف زندگی گزاری لیکن اب تم آزاد ہو اور ایک اچھی خوشگوار زندگی گزارنے یہاں آئے ہو۔ آئندہ جب بھی تم پر ایسی کوئی کیفیت طاری ہو اور تمہیں کوئی ہونے والی بات آنکھوں کے سامنے نظر آئے تو اپنا تجزیہ کرنا کہ وہ کون سا ماحول ہے۔ کون سی کیفیت ہے اور تم اپنے آس پاس ظاہری طور پر اور باطنی طور پر کیا محسوس کررہے ہو۔ یہ تمہارے لئے بے حد ضروری ہے۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ قدیر بیگ نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے انٹیلی جنس کے آفیسر صمد بخاری نے کہا۔ "ہیلو ڈاکٹر! میں حیدر آباد سے بول رہا ہوں۔"

"تم وہاں کیا کررہے ہو؟" سی ایم او نے پوچھا۔

"کاشف کے چچا بشیر احمد کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔"

"کیا بشیر احمد حیدر آباد میں ہے؟ اس نے ابھی ابھی فون پر ہم سے بات کی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ کاشف کی والدہ بھی ہیں۔"

"ہاں' دونوں ہی یہاں بیرسٹر کلیم اللہ سے ملنے آئے ہیں۔"

"تعجب ہے ان کا مقدمہ اگر شروع ہوا تو کراچی میں ہوگا اور وہ حیدر آباد کے بیرسٹر سے ملنے گئے ہیں۔"

"تعجب تو مجھے بھی ہوا تھا۔ پھر پتا چلا کہ بیرسٹر کلیم اللہ چار برس پہلے کراچی میں تھے۔ اب مستقل رہائش کے لئے حیدر آباد آگئے ہیں۔ چار برس پہلے بیرسٹر کلیم اللہ نے ہی کاشف کو پاگل ثابت کیا تھا اور عدالت سے درخواست کی تھی کہ اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔ اس لئے وہ لوگ پھر اسی بیرسٹر سے مشورہ لینے گئے ہیں۔"

"تمہارے ماتحت یہ معلومات حاصل کرسکتے تھے۔ تمہیں اتنی دور جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت پیش آگئی تھی۔ بشیر احمد شام کے پانچ بجے کاشف کی والدہ کے ساتھ کار میں کراچی سے روانہ ہوا۔ میں نے سوچا' آخر شام کو نیشنل ہائی وے پر جانے کا کیا مطلب ہے۔ اگر حیدر آباد جارہا ہے تو ان کی واپسی بڑی رات کو ہوگی اور جب سے نیشنل ہائی وے پر دو زبردست ڈکیتیاں ہوچکی ہیں کوئی بھی شریف آدمی اپنی عورت کے ساتھ رات کو سفر نہیں کرتا۔ اس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ بشیر احمد رات کو واپس نہیں آئے گا اور واپس نہیں آئے گا تو ان محترمہ کے ساتھ رات کہاں قیام کرے گا اور جہاں بھی قیام کرے گا' کس رشتے سے کرے گا؟"

قدیر بیگ نے کہا۔ "سمجھ گیا بھئی۔ تم آخر جاسوس ٹھہرے۔ بہت دور تک سوچتے ہو۔"

"صحیح لائن پر سوچا جائے تو صحیح نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ میں نے حیدر آباد پہنچتے ہی دیکھا انہوں نے یہاں کے ایک بہت بڑے ہوٹل میں ایک کمرہ بک کیا ہے' اس کے بعد ہی دونوں بیرسٹر کے پاس گئے اور ابھی تک واپس نہیں آئے۔ میرا ایک ماتحت ان کے پیچھے لگا ہوا ہے' وہ مجھے اطلاعات فراہم کررہا ہے۔ مجھے یقین ہے' میں آج رات ان میاں

بیوی کی پول کھول دوں گا۔"

سی ایم او نے خوش ہو کر کہا۔ "وِش یو گڈ لک۔" پھر اس نے دوچار باتیں کیں اور ریسیور رکھ دیا۔

☆------☆------☆

دوسری طرف بشیر احمد ذہنی طور پر بہت زیادہ انتشار میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس نے بیرسٹر کلیم اللہ کے مشورے پر ہی اس کے دفتر میں بیٹھ کر فون کیا تھا۔ بیرسٹر نے مشورہ دیا تھا کہ کسی طرح سی ایم او سے سمجھوتا کرنے کی کوشش کی جائے۔ پہلے کاشف کی والدہ نے اپنے بیٹے سے بات کی تھی اور مایوس ہو گئی تھی۔ اس کے بعد بشیر احمد نے قدیر بیگ سے بات کرنے کے بعد بیرسٹر کلیم اللہ کے سامنے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ سی ایم او کا رویہ بالکل دشمنوں جیسا ہے اور وہ طنز کے سوا کوئی دوسری بات نہیں کرتے۔ ایسے آدمی سے سمجھوتا ممکن نہیں ہے۔

بیرسٹر نے کہا۔ "آپ پاگل خانے کے ڈاکٹر' انسپکٹر اور اسسٹنٹ وارڈن کو اپنی مٹھی میں رکھیں۔ اگر ان میں سے کوئی اعتراف کرے گا کہ کاشف کو ہیجان انگیز انجکشن لگایا جاتا تھا تو تمہاری پوزیشن کمزور ہو جائے گی۔"

بیگم نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "بشیر احمد! تم مجھے دھوکا دیتے رہے۔ میرے بیٹے کو انجکشن کے ذریعے پاگل بناتے رہے اور مجھ سے جھوٹ بولتے رہے' میرا بیٹا التجائیں کرتا رہا' بچوں کی طرح بلکتا رہا۔ قسمیں کھا کر مجھ سے کہتا رہا کہ اس پر ظلم ہو رہا ہے لیکن میں اس کی باتوں پر یقین نہیں کرتی تھی۔ تم پر اندھا اعتماد کرتی چلی آئی۔"

بیرسٹر نے کہا۔ "بھائی! تم دونوں میں ابھی سے اختلاف ہے تو پھر تم دونوں کا خدا حافظ ہے۔"

بشیر احمد نے کہا۔ "نہیں بیرسٹر صاحب! یہ بس یونہی کبھی کبھی غصے میں آجاتی ہیں ان کو میں ہینڈل کر لوں گا۔"

"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں' کسی بھی کیس کے سلسلے میں اب کراچی نہیں جاتا ہوں۔ تم نے مشورہ کے لئے کہا تھا سو میں نے مشورہ دے دیا۔ سی ایم او قدیر بیگ زیادہ سے زیادہ یہ ثابت کر سکتا ہے کہ کاشف منیر پر پاگل پن کا دورہ نہیں پڑتا........ لیکن اس سے

یہ نہیں ثابت ہوتا کہ ماضی میں بھی دورہ نہیں پڑتا ہو گا۔ پاگل خانے کے ڈاکٹر اور دوسرے لوگ یہ گواہی میں کہہ سکتے ہیں کہ پہلے دورہ پڑتا تھا پھر یہ بتدریج نارمل ہونے لگا۔ جب سی ایم او قدیر بیگ کے پاس گیا تو مکمل طور پر نارمل ہو گیا۔ باتیں بنائی جا سکتی ہیں۔ وہاں جا کر کسی اچھے بیرسٹر کو پکڑو۔ اس کیس میں تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ بشرطیکہ پاگل خانے کے وہ تینوں افراد تمہاری مٹھی میں رہیں۔ دیٹس آل' رات کافی ہو چکی ہے۔ اب میں آرام کرنے جا رہا ہوں۔"

وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر باہر آئے اور اپنی کار میں بیٹھ گئے۔ بیگم روتی جا رہی تھیں اور بڑبڑاتی جا رہی تھیں۔ بشیر احمد نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "جب بیٹے سے اتنی ہی محبت تھی تو اسے منحوس سمجھنے کے باوجود گلے لگا کر کیوں نہیں رکھا۔ اسے دور کیوں بھگاتی رہیں؟"

"یہ میری غلطی تھی کہ میں اسے منحوس یا پاگل سمجھتی رہی لیکن تم نے تو سچ مچ اسے پاگل بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔"

"تم بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ جانتی تھیں کہ بھائی جان کے کاروبار کی آمدنی تمہارے ہاتھوں میں آتی رہے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ کاشف ہم سے دور رہے۔ اس نے پہلے ہی تصور میں تمہیں دلہن کی حیثیت سے دیکھ کر ہماری شادی کی پیش گوئی کر دی تھی۔ اگر وہ ہمارے ساتھ رہتا تو کسی وقت بھی ہمارا بھید کھل سکتا تھا۔ تم نے میری بات سے اتفاق کیا تھا کہ وہ نیم پاگل ہے یا اسے دورہ پڑتا ہے تو اسے پاگل خانے میں زیر علاج رہنا چاہئے۔"

"ہاں' میں نے پاگل خانے میں زیر علاج رکھنے کے لئے کہا تھا' اسے پاگل بناتے رہنے کے لئے نہیں کہا تھا۔"

"تم بیٹے کے لئے گڑھا کھودنے کے لئے بھی کہتی ہو اور یہ بھی چاہتی ہو کہ وہ اس میں دفن نہ ہو تو یہ کیسی احمقانہ بات ہے۔ بیگم! ذرا غور کرو تو تمہیں یقین آجائے گا کہ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے تمہاری محبت اور تمہاری خوشیوں کے لئے کیا ہے۔ وہ لڑکا بچپن میں بھی منحوس تھا' جوانی میں بھی منحوس ثابت ہو رہا ہے۔ آئندہ بھی وہ تمہارے لئے عذاب جان بن جائے گا۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ زندہ رہے' تم اسے پاگل خانے میں دیکھتی رہو

اور تمہاری ماتا کی تسلی ہوتی رہے اور وہ رفتہ رفتہ اس طرح پاگل ہوجائے کہ وہاں سے کبھی رہا نہ ہوسکے صرف تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے کے لئے زندہ رہے۔ میں نے تم سے کوئی دشمنی نہیں کی ہے۔ جب وہ مستقل طور پر پاگل ہی رہتا تو وصیت کی رو سے بھائی جان کی تمام جائیداد اور تمام کاروبار کی مالک صرف تم ہوتیں۔"

"مجھے نہیں چاہئے ایسی جائیداد اور ایسی دولت۔"

"ٹھیک ہے' میں نے اب تک تمہارے لئے برا کیا ہے اور میں تمہارا دشمن ہوں پھر دیر کس بات کی ہے؟ مجھے چھوڑ دو۔ میں اپنی راہ چلا جاؤں گا۔ اس دنیا میں اکیلا ہوں۔ ایک بیٹی تھی' وہ بہن کے ہاں پرورش پا رہی ہے۔ تم بھی اپنی جگہ خوش رہنا۔ میرے جانے کے بعد شاید وہ تمہارا بیٹا تمہیں معاف کردے اور تمہارے گلے لگ جائے۔ میری محبت کی قسم کھانے والی عورت کے لئے بیوفائی کا یہ اچھا موقع ہے۔"

وہ روتے ہوئے بولیں۔ "مجھے طعنے نہ دو۔ میں دوراہے پر ہوں' نہ بیٹے کے خلاف کچھ ہوتے دیکھ سکتی ہوں اور نہ تمہیں چھوڑ سکتی ہوں۔"

"پہلے اپنے آپ کو اچھی طرح جانچ پرکھ لو کہ تم چاہتی کیا ہو؟ اگر مجھے چھوڑنا چاہو تو میں ہنستے ہوئے رخصت ہوجاؤں گا۔ اب اپنے آنسو پونچھو' ہوٹل قریب ہے۔"

وہ آنسو پونچھنے لگیں۔ بشیر احمد نے ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ "کل جب یہاں سے جائیں گے تو تم کاشف سے پھر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنا۔ میں بہت پریشان ہوں۔ اس لڑکے نے یہ کہہ کر مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے کہ اس نے مجھے مستقبل کے آئینے میں دیکھ لیا ہے۔ مجھے اس نے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ریسیور رکھ دیا تھا کبھی سوچتا ہوں' وہ انسانی نفسیات سے کھیل رہا ہے۔ پھر سوچتا ہوں کہ نہیں' اس کی پیش گوئیاں ہمارے سامنے درست ہوچکی ہیں۔ وہ میرے انجام سے باخبر ہوگا تم بہلا پھسلا کر پوچھو گی تو......... شاید تمہیں بتادے۔"

"میں کل یہاں سے جاتے ہی اسے فون کروں گی۔ پھر اس سے بات کرنے کی کوشش کروں گی۔"

بشیر احمد نے کار کو لاک کیا۔ پھر وہ دونوں ہوٹل کے اندر آئے۔ کاؤنٹر سے اپنے کمرے کی چابی لی۔ پھر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر جانے لگے۔ بشیر احمد نے آہستگی سے

کہا۔ "وہ چیف میڈیکل آفیسر قدیر بیگ بہت ہی کائیاں ہے۔ ہوسکتا ہے وہ کاشف کے ذریعے مجھے دماغی خلجان میں مبتلا کر رہا ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں؟"

"صبر کرو۔ میں نے کہا نا' کل میں کاشف سے بات کروں گی۔ اگر تم بہت زیادہ بے چین ہو تو یہیں سے فون کروں؟"

"ہرگز نہیں۔ کسی کو معلوم ہوسکتا ہے کہ ہم یہاں ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

وہ کمرے میں آگئے۔ ایک ملازم نے آکر کھانے کے لئے پوچھا۔ انہوں نے انکار کردیا۔ دونوں کی بھوک مرگئی تھی......... بشیر احمد نے دروازے کو اندر سے بند کردیا۔

تقریباً پندرہ بیس منٹ کے بعد دستک سنائی دی۔ اس نے دروازے کو کھولا تو باہر ایک پولیس انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ "سوری مسٹر! یہاں ہوٹلوں میں غلط قسم کے لوگ بھی آتے ہیں۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں پوچھ سکتا ہوں آپ دونوں کون ہیں؟"

بشیر احمد نے کہا۔ "ہم میاں بیوی ہیں۔ کراچی سے آئے ہیں۔ رات زیادہ ہوگئی اس لئے واپس جانا نہیں چاہتے۔ کل صبح چلے جائیں گے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "یہ تو میں ہوٹل کے رجسٹر میں دیکھ چکا ہوں۔ آپ دونوں کا نام میاں بیوی کی حیثیت سے درج ہے لیکن اس کا ثبوت کیا ہے؟"

"آپ کس قسم کا ثبوت چاہتے ہیں۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہر شادی شدہ جوڑا اپنے ساتھ اپنا نکاح نامہ لے کر گھومتا رہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "آپ درست فرماتے ہیں۔ سبھی شادی شدہ جوڑوں کے پاس نکاح نامہ نہیں ہوتا' حالات کے تحت کبھی گم ہوجاتا ہے' کہیں ضائع ہوجاتا ہے لہٰذا میں آپ سے نکاح نامہ طلب نہیں کروں گا۔"

"تو پھر؟" بشیر احمد نے پوچھا۔

"آپ کسی معزز شخص کی گواہی پیش کرسکتے ہیں۔"

اسے بیرسٹر کا خیال آیا۔ اس نے کہا۔ "ابھی ہم بیرسٹر کلیم اللہ کے پاس سے آرہے ہیں۔ وہ ہمیں میاں بیوی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔"

انسپکٹر نے ٹیلیفون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ ان سے رابطہ قائم

کریں۔ اگر وہ آپ کی گواہی دینے پر راضی ہوئے تو میں ان سے بات کروں گا۔"

اس نے فون کا ریسیور اٹھایا' ہوٹل کے ایکسچینج سے بیرسٹر کلیم اللہ سے رابطہ قائم کرانے کے لئے کہا۔ پھر انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد بیرسٹر کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو' میں بیرسٹر کلیم اللہ بول رہا ہوں۔"

اس نے اپنا نام بتاتے ہوئے کہا۔ "یہاں ہوٹل میں ایک پولیس انسپکٹر صاحب آئے ہیں اور تصدیق چاہتے ہیں کہ میں اپنی شریکِ حیات بانو بیگم کا شوہر ہوں؟ آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں' انسپکٹر صاحب کو فون کے ذریعے بتا دیجئے۔"

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ پھر بیرسٹر نے پوچھا۔ "کیا انسپکٹر تمہارے سامنے موجود ہے؟"

"ہاں۔ کیا میں ریسیور دوں؟"

"ذرا ٹھہرو! عقل سے کام لو۔ اگر میں تم دونوں کے رشتے کی تصدیق کروں گا تو یہ بات کبھی عدالت میں بھی اٹھ سکتی ہے۔"

بشیر احمد نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "تو پھر؟"

"پھر کیا۔ انسپکٹر کو فون دو۔ میں گول مول باتیں کرتا ہوں۔"

اس نے انسپکٹر کو فون دیا۔ انسپکٹر نے وہی سوال دہرایا۔ بیرسٹر کلیم اللہ نے کہا۔ "مسٹر بشیر احمد میرے مؤکل ہیں۔ میں انہیں اسی حد تک جانتا ہوں جس حد تک ان کے معاملات میرے ہاتھ میں رہتے ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ دونوں میاں بیوی ہیں لیکن تصدیق نہیں کر سکتا۔"

انسپکٹر نے پوچھا۔ "آپ تصدیق کیوں نہیں کر سکتے؟"

"میں ایک بیرسٹر ہوں۔ صرف سنی سنائی باتوں پر تصدیق نہیں کر سکتا۔ میں ان کی سماجی حیثیت کو دوسروں کے ذریعے جانتا ہوں۔ اگر آپ تصدیق کرنا چاہتے ہیں تو یہ آپ کا معاملہ ہے' آپ ان سے نکاح نامہ یا گواہ طلب کریں۔"

انسپکٹر نے ریسیور رکھ دیا۔ بشیر احمد کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "بیگم صاحبہ! آپ کے پاس نکاح نامہ ہوگا؟ یہاں نہ سہی' اپنے گھر میں۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "جی' جی میرے پاس ہے۔"

بشیر احمد نے پوچھا۔ "انسپکٹر صاحب! کیا بیرسٹر صاحب نے تصدیق نہیں کی ہے؟"

"وہ کہتے ہیں کہ آپ دونوں میاں بیوی ہیں لیکن وہ بحیثیت بیرسٹر تصدیق نہیں کر سکتے۔"

"لیکن جناب! بیرسٹر نے ہمیں یہاں میاں بیوی تسلیم تو کیا ہے کیا اتنا کافی نہیں ہے؟ نکاح نامہ یہاں سے تقریباً دو سو میل دور ہے۔ آپ اتنی دور جاکر اب وہ کاغذات دیکھنے سے رہے۔ آپ چاہیں تو بات یہیں دوستانہ ماحول میں ختم ہو سکتی ہے۔"

انسپکٹر نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مسٹر صمد بخاری! آپ دوستانہ ماحول کے لئے تشریف لے آئیں۔"

صمد بخاری مسکراتا ہوا اندر آیا۔ پھر اس نے بشیر احمد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے نہیں پہچانتے لیکن میں تم دونوں میاں بیوی کو خوب پہچانتا ہوں۔ میں نے یہاں کا رجسٹر بھی چیک کیا ہے۔ پتا چلا کہ دو ماہ پہلے بھی تم دونوں یہاں آکر ایک دن گزار چکے ہو۔ آج شام کو کراچی سے تم لوگوں کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا ہوں اور تم لوگوں کے ساتھ واپس جاکر وہ نکاح نامہ ضرور دیکھوں گا۔"

بشیر احمد نے کہا۔ "اور ہم ضرور دکھائیں گے۔ ہم مجرم یا گنہگار نہیں ہیں۔"

صمد بخاری نے کہا۔ "جب آپ نے اعتراف کر ہی لیا ہے تو پھر ہم بیگم صاحبہ کو حراست میں لیتے ہیں۔"

بشیر احمد نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "آپ حراست میں کیوں لیں گے؟"

"اس لئے کہ آپ مجرم نہیں ہیں لیکن یہ مجرمہ ہیں۔ آپ کی منکوحہ ہو کر دنیا والوں کی اور قانون کی نظروں میں منیر احمد کی بیوہ بنتی ہیں......... اور ان کی ٹیکسٹائل ملز کی آمدنی حاصل کرتی رہیں۔"

بشیر احمد نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا صمد بخاری نے سخت لہجے میں کہا۔ "یو شٹ اپ' نو مور آرگومنٹ۔ آپ کمرے سے باہر چلے جائیں۔ میں بیگم صاحبہ سے تنہائی میں باتیں کروں گا۔"

اس نے بے بسی سے بیگم کو دیکھا پھر سر جھکا کر باہر چلا گیا۔ صمد بخاری نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے بشیر احمد سے شادی کب کی؟"

"یہی کوئی دو برس پہلے۔"

"یہ سلسلہ کس طرح ہوا؟"

"میں اپنے شوہر کی موت کے بعد رفتہ رفتہ بشیر احمد سے متاثر ہوتی گئی۔"

"اپنے شوہر کی موت کے بعد نہیں، قتل کے بعد کہو۔"

"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ کار کے حادثے میں ہلاک ہوئے تھے۔"

"اور کار کے پہیے کو بشیر احمد نے لوز کیا تھا۔"

"آپ مجھے الزام نہ دیں۔ اس وقت میں بشیر سے نہ تو متاثر تھی اور نہ اس کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کا کوئی ارادہ رکھتی تھی۔"

"تمہارے ایسا کہنے سے حقیقت نہیں بدل جائے گی۔ تم دونوں نے ازدواجی رشتہ قائم کرنے کے لئے پہلے منیر احمد کو راستے سے ہٹایا۔ پھر بشیر کی بیوی کو قتل کردیا۔"

وہ چیخ کر بولی۔ "نہیں، یہ جھوٹ ہے۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔"

"عدالت میں جب یہ ثابت ہوجائے گا کہ کاشف کو ہیجان انگیز انجکشن لگایا جاتا تھا تو سوال پیدا ہوگا کہ کیوں لگایا جاتا تھا؟ اس کا جواب تو یہی ہے کہ اپنے جرم کو چھپانے کے لئے اسے جنونی قاتل بناکر مقتولہ کے کمرے میں چھوڑ دیا گیا۔ دوسرا اہم مقصد یہ تھا کہ کاشف پاگل بن کر ہمیشہ پاگل خانے میں رہے اور تم بشیر احمد کے ساتھ اس کے باپ کی دولت پر عیش کرتی رہو۔"

"یہ جھوٹ ہے، یہ جھوٹ ہے۔ بے شک میں نے بشیر احمد سے شادی کرنے کے بعد بھی منیر احمد کی بیوہ بننے کا ناٹک کیا ہے، میں مجرم ہوں لیکن میں نے اپنے بیٹے کو ہمیشہ پاگل رکھنے کے متعلق کبھی نہیں سوچا تھا۔"

"جو عورت شادی شدہ ہوکر بیوہ بنتی رہے اور قانون کی نظروں میں دھول جھونکتی رہے، وہ سب کچھ کرسکتی ہے۔ ذرا سوچو اور سمجھو۔ آئندہ کبھی عدالت میں وہ دن کیسا ہوگا جب تمہارے سامنے کٹہرے میں کھڑا ہوا تمہارا اپنا بیٹا تمہارے خلاف بیان دے گا۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے سر کے بالوں کو جکڑ کر بولی۔ "نہیں میں ایسا وقت نہیں آنے دوں گی۔"

صمد بخاری نے کہا۔ "بشیر احمد کا کچھ زیادہ نہیں بگڑے گا۔ مثلاً تم نے بشیر سے شادی

کی لیکن اپنے مرحوم شوہر کی رقم خود وصول کرتی رہیں۔ تمام رسیدوں پر تمہارے دستخط ہیں۔ بشیر کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ وہ تو اس دولت پر عیش کرتا آرہا ہے۔ اسی طرح تم نے اپنے بیٹے کو کبھی آسیب زدہ کہا اور کبھی پاگل کہا، کبھی دماغی امراض کے ڈاکٹروں سے اس کے خلاف رپورٹ لکھواتی رہیں۔ کبھی ماہر نفسیات سے تحریری تصدیق کراتی رہیں۔ اب اگر یہ ثابت بھی ہوگیا کہ کاشف کو ہیجان انگیز انجکشن لگوایا جاتا تھا تو یہ ثابت نہیں ہوسکے گا کہ یہ انجکشن لگوانے میں بشیر احمد کا ہاتھ رہا ہے۔ اپنے بیٹے کو ابتدا سے پاگل ثابت کرتے رہنے میں تم نے اہم رول ادا کیا ہے۔"

وہ چکرا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ صمد بخاری نے آگے بڑھ کر کہا۔ "تم ہر طرح سے پھنس رہی ہو۔ اگر تم نے اب بھی اپنے بیٹے کا ساتھ دیا تو تمہاری سزا کم سے کم ہوسکتی ہے۔ ہم بشیر احمد کو بے نقاب کرنا چاہتے ہیں۔ تم ہمارا ساتھ دوگی اور اپنی سوکن کے قتل کی گواہی بشیر احمد کے خلاف دوگی تو اتنا ضرور ہوگا کہ لوگ تم سے نفرت کرنے کے باوجود تمہاری ماتا کو سراہیں گے، یہ تو کہیں گے کہ تم نے بیٹے کی خاطر جھوٹ کو بے نقاب کیا ہے اور مجرم کو اس کی سزا تک پہنچایا ہے۔ میں تمہیں سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔ میرے ساتھ چلو۔ یہاں سے کراچی تک تم میری گاڑی میں چلوگی اور ان معاملات پر غور کرتی رہوگی۔ وہاں پہنچ کر بشیر احمد کے خلاف بیان دینا چاہوگی تو ہم پوری طرح تمہاری حفاظت کریں گے۔ وہ تمہیں ذرا نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"

"مجھے کوئی کیا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ مجھے قتل کیا جاسکتا ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتی۔ اگر میرا بچہ پاگل نہیں ہے تو میں اس کے حق میں وہی بیان دے سکتی ہوں جو میں جانتی ہوں۔ اسی طرح میں اپنے شوہر کی وفادار بیوی ہوں۔ میں نے پہلے شوہر کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی۔ نہ اپنے موجودہ شوہر کے ساتھ بے وفائی کرسکتی ہوں۔ مجھے جو کچھ معلوم ہے، میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکوں گی۔ آپ یہ چاہیں گے کہ میں بیٹے کی حمایت میں اپنے شوہر کو خواہ مخواہ پھانسی کے پھندے پر پہنچادوں تو یہ ناممکن ہے۔ میں آج بھی اپنے شوہر کو بے قصور سمجھتی ہوں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے انہیں کبھی ایک قاتل کے روپ میں نہیں دیکھا۔ میں نہیں جانتی کہ میرے شوہر کو یا میری سوکن کو کس نے قتل کیا ہے۔ بخدا جانتی تو ابھی اس کا نام بتادیتی۔"

"چلو مان لیا کہ تم اپنے موجودہ شوہر کو قاتل کی حیثیت سے نہیں جانتی ہو لیکن یہ ضرور معلوم ہوگا تمہیں کہ کاشف کو وہی ضرر رساں انجکشن لگاتا رہا ہے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ "میں نے اپنی آنکھوں سے کبھی نہیں دیکھا۔ البتہ سنا ہے کہ ان کے کہنے پر وہ انجکشن لگایا جاتا تھا لیکن میں سنی ہوئی بات کہہ رہی ہوں۔ کیا عدالت میں سنی ہوئی بات کو تسلیم کیا جائے گا؟"

صمد بخاری نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "اچھی بات ہے تم یہاں سے چلو۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھی' مختصر سا سامان سمیٹ کر ایک بیگ میں رکھتے ہوئے بولی۔ "میں اپنے شوہر کے ساتھ چلوں گی۔"

"تمہارے شوہر کو الگ گاڑی میں لے جایا جائے گا۔ تم میرے ساتھ چلو اور تنہائی میں سوچتی رہو۔"

"میں نے کہہ دیا نا' سوچتے وہ ہیں جو باتیں بنا کر بولنا چاہتے ہیں۔ میرے پاس صاف اور سیدھی حقیقتیں ہیں۔ میں یہاں سے عدالت تک وہی کہوں گی جو سچائی کا تقاضا ہے لیکن اپنے شوہر کے ساتھ یہاں سے جاؤں گی۔ اتنا قانون تو میں بھی جانتی ہوں کہ آپ بیان لیتے وقت مجھے میرے شوہر سے علیحدہ کر سکتے ہیں لیکن جب تک میرے حوالات میں جانے کی نوبت نہ آئے یا عدالت اپنا فیصلہ نہ سنائے۔ اس وقت تک مجھے میرے شوہر سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔"

صمد بخاری نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے' تم اپنے شوہر کے ساتھ چلو۔ آؤ۔"

وہ بیگ اٹھا کر اپنے شانے سے لٹکاتے ہوئے باہر آئی۔ باہر بشیر احمد کھڑا ہوا تھا' وہ اس کے ساتھ چلنے لگی۔ پولیس انسپکٹر اور دو سپاہی ان کے پیچھے تھے۔ سب سے آگے صمد بخاری چل رہا تھا اور وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہوٹل کے باہر بیگم کی بڑی سی قیمتی کار کھڑی ہوئی تھی۔ وہ منیر احمد کی بیوہ کی حیثیت سے قیمتی کاروں میں گھومتی تھی' عالیشان کوٹھی میں رہتی تھی اور مرحوم شوہر کی دولت پر عیش کر رہی تھی۔ انسپکٹر نے پوچھا۔ "کیا ہمارے سپاہی آپ کے ساتھ جائیں گے؟"

صمد بخاری نے بیگم کو اور بشیر احمد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ شریف لوگ ہیں۔ ان

کے ساتھ سپاہیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ساتھ اگر کوئی بدمعاش سفر کر رہا ہوتا' تب بھی میں اکیلا اس کے لئے کافی ہوتا۔" پھر اس نے بشیر احمد سے کہا۔ "تم اپنی بیگم کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔ تمہاری کار میں ڈرائیو کروں گا اور اسسٹنٹ میرے ساتھ بیٹھے گا۔"

وہ اسی ترتیب سے بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگئے۔ راستے میں بشیر احمد نے پوچھا۔ "مسٹر بخاری! کیا آپ سی ایم او قدیر بیگ کے لئے کام کر رہے ہیں؟"

"میں سرکاری آدمی ہوں۔ کسی خاص شخص کے لئے کام نہیں کرتا۔ قانون کی برتری قائم رکھنا میرا فرض ہے۔ ویسے بشیر احمد تم خوش نصیب ہو' تمہاری بیگم بہت وفادار ہیں۔ انہوں نے تمہارے خلاف بیان دینے سے صاف انکار کر دیا ہے۔"

بشیر احمد نے فخر اور محبت سے بیگم کو دیکھا۔ پھر کہا۔ "مسٹر بخاری! ہم نے صرف ایک ہی جرم کیا ہے۔ دولت کے لالچ میں اپنی شادی کو چھپائے رکھا۔ اگر اس جرم کی سزا میری بیگم کو ملے گی تو میں چاہوں گا کہ اس کے ساتھ میں بھی سزا پاؤں۔"

صمد بخاری نے کہا۔ "افسوس' آپ کو بیگم کے برابر سزا نہیں ملے گی۔ ہاں' ایک مجرمہ کا ساتھ دینے کے جرم میں عدالت پتا نہیں آپ کے خلاف کیا فیصلہ سنائے۔"

بشیر احمد نے کہا۔ "کاشف ہمارا بیٹا ہے۔ ہم اس کے دشمن نہیں ہیں اس نے غلط فہمی کی بنا پر سی ایم او سے جو کچھ بھی کہا ہے' اس کے نتیجے میں وہ صاحب ہمارے دشمن ہوگئے ہیں۔"

صمد بخاری نے کہا۔ "یہ تو میں اپنے طور پر ذاتی حیثیت سے تھوڑی دیر پہلے آپ کی بیگم کو آپ کے خلاف بیان دینے پر آمادہ کر رہا تھا ورنہ آپ یقین کریں۔ سی ایم او قدیر چاہتے ہیں کہ آپ کے خلاف عدالت میں کوئی مقدمہ نہ ہو۔"

"میرے خلاف آخر مقدمہ کیا ہو سکتا ہے؟"

"ایسا تو نہ کہو۔ اگر ہم گڑے مردے اکھاڑنا چاہیں تو کاشف کے والد کی حادثاتی موت اور تمہاری پہلی بیوی کا قتل ایسے گل کھلا سکتا ہے کہ تمہارے ہوش اڑ جائیں گے۔ سنگین مقدمات میں کس کی ہار ہوتی ہے' کس کی جیت ہوتی ہے' یہ کوئی نہیں جانتا ہو سکتا ہے کہ تمہاری جیت ہو جائے' تمہیں سزا نہ ہو لیکن تمہارے دن اور رات سکون سے

نہیں گزریں گے۔ تمہاری بیگم فراڈ کے الزام میں سلاخوں کے پیچھے رہیں گی۔ تمہاری آمدنی یکلخت بند ہو جائے گی۔ تمہارا جو بنک اکاؤنٹ ہے' اس کا حساب کیا جائے گا کہ تمہاری آمدنی کا ذریعہ کیا رہا ہے۔ بہت سی پریشانیاں تمہارا استقبال کرنے کو تیار ہیں۔ اس کے علاوہ پاگل خانے کا ایک اہم آدمی تمہارے خلاف گواہ بننے کو تیار ہے۔ اس کی گواہی سے تمہیں کوئی نقصان پہنچے گا یا نہیں۔ یہ بعد کی باتیں ہیں لیکن میں نے کہا نا سی ایم او قدیر بیگ تمہارے خلاف کوئی مقدمہ نہیں کرنا چاہتا۔"

بشیر احمد نے کہا۔ "تعجب ہے۔ آخر وہ میرے ہمدرد کیوں ہیں؟"

"اس لئے کہ جس کے دن پورے ہو جاتے ہیں' اس سے یوں بھی انسانیت کے ناطے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔"

"کیا مطلب! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"یہی کہ کاشف نے تمہارے مستقبل کا حال ہمیں بتا دیا ہے۔ جب ہم تمہارا انجام جانتے ہیں تو قدیر بیگ مقدمے بازی میں اپنی رقم کیوں ضائع کرے گا۔"

بیگم اور بشیر دونوں ایک دوسرے کو پریشان ہو کر دیکھ رہے تھے۔ بشیر بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ بیگم کے دماغ میں کاشف کی وہ تمام پیش گوئیاں گونج رہی تھیں جو اس نے مختلف اوقات میں بیان کی تھیں۔ وہ پریشان ہو کر بشیر کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ تسلی کے طور پر رکھتے ہوئے بولی۔ "یہ لڑکا ہمیں خواہ مخواہ دہشت زدہ کر رہا ہے۔"

صمد بخاری نے کہا۔ "اس لڑکے نے جب بھی پیش گوئی کی ہوگی تو اس کے پورا ہونے سے پہلے یہی خیالات آپ لوگوں کے دماغ میں آئے ہوں گے کہ وہ دہشت زدہ کر رہا ہے لیکن اس کی ہر پیش گوئی درست ثابت ہوئی اور اگر کوئی ایک غلط ثابت ہوئی ہو تو تم میں سے کوئی مجھے بتائے؟"

وہ دونوں پھر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ کاشف نے بقول ان کے اپنی کالی زبان سے جو بھی کہا تھا' وہ پورا ہوا تھا۔ وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ بیگم نے پوچھا۔ "کیا کاشف نے آپ کے سامنے پیش گوئی کی تھی؟"

"جی ہاں' ہم پچھلی دوپہر تین بجے قدیر بیگ کے ہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ کاشف نے ہماری موجودگی میں ایک طرف تکتے ہوئے کہا۔ میں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں

کہ.........."

صمد بخاری نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ بشیر احمد نے ایک دم سے سیٹ پر سیدھی طرح بیٹھ کر جلدی سے پوچھا۔ "کہ.......... کہ آگے بتاؤ اس نے کیا کہا؟ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے کیا دیکھ رہا تھا؟"

صمد بخاری نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ پھر ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے کہا۔ "کاشف اس وقت خلا میں تک رہا تھا اور ایسی گمبھیر آواز میں بول رہا تھا جیسے وہ آواز کسی اندھے کنوئیں سے آ رہی ہو وہ کہہ رہا تھا میں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ بادل گرج رہے ہیں' بجلیاں چمک رہی ہیں' موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور امی کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے فرش پر بیٹھی اپنے دونوں ہاتھوں کی چوڑیاں ایک ایک کر کے توڑتی جا رہی ہیں۔"

بیگم نے یکبارگی چیخ کر کہا۔ "نہیں' یہ جھوٹ ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میرے ہاتھوں کی چوڑیاں دوسری بار نہیں ٹوٹیں گی۔ میرا سہاگ سلامت رہے گا۔"

وہ بے اختیار اپنے موجودہ شوہر کے بازو سے چپک گئی۔ موجودہ شوہر کی حالت غیر تھی۔ وہ اندر ہی اندر لرز رہا تھا۔ اگرچہ برسات کا موسم کب کا گزر چکا تھا لیکن اس کے دماغ کے آسمان پر بادل گرج رہے تھے اور اس کے دل کی زمین پر بجلیاں گر رہی تھیں۔

☆------☆------☆

ایک ماہ گزر گیا۔ کاشف پر ایک بار بھی دورہ نہیں پڑا۔ اس کے برعکس بشیر احمد پر دورے پڑنے لگے تھے۔ مختلف ڈاکٹروں کی رپورٹیں کاشف کو نارمل اور صحت مند ثابت کرتی جارہی تھیں۔ دوسری طرف بشیر احمد بظاہر صحت مند تو تھا لیکن نارمل نہیں ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی جھنجلا جاتا تھا۔ کبھی گھنٹوں ایک جگہ بیٹھا سوچتا رہ جاتا تھا۔ اس کے تصور میں موسلا دھار بارش ہونے لگتی تھی۔ بارش کے شور میں چوڑیوں کے ٹوٹنے کی ہلکی سی آواز اس کے اندر دھماکے کی طرح گونجنے لگتی تھی۔ ایسے وقت میں وہ لیٹا ہوتا تو گھبرا کر اٹھ بیٹھتا۔ بیٹھا ہوتا تو اٹھ کر کھڑا ہو جاتا اور کھڑا ہوتا تو پریشان ہو کر اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگتا تھا جیسے موت سے دور بھاگنے کا راستہ تلاش کر رہا ہو۔

موت ایک بہت بڑا اور مضبوط قلعہ ہے جس کے اندر زندگی محفوظ ہے۔ اسی قلعے کے اندر زندگی اپنے معیار کے مطابق سانس لیتی رہتی ہے۔ اس کے بعد فرار کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ اسی لئے بشیر احمد کو بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کدھر بھاگے؟ کیسے جان بچائے؟

بیگم کو پہلے تو فراڈ کے الزام میں حراست میں لیا گیا تھا۔ پھر خود سی ایم او قدیر بیگ نے ان کی ضمانت لے لی۔ آخر وہ کاشف کی والدہ تھیں۔ رشتے کا کچھ تو لحاظ رکھنا ہی تھا۔ اب ان پر مقدمہ چل رہا تھا لیکن انہیں بیٹے سے ملنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا۔ کیونکہ کاشف کو قانوناً اپنے مرحوم والد کی دولت' جائیداد اور کاروبار کے حقوق دلانے کی جدوجہد جاری تھی۔ ایسے وقت میں وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کی ماں قریب آئے۔ اس کے ذریعے اس کے دشمن بھی موقع پا کر کسی ہتھکنڈے سے پھر اسے پاگل ثابت کر سکتے تھے۔

بیگم کے بے حد اصرار پر سی ایم او نے فون پر بیٹے سے بات کرنے کی اجازت دی۔

بیگم نے رابطہ قائم ہوتے ہی کہا۔ "بیٹے! تم نے تو مجھے بالکل ہی اپنا دشمن سمجھ لیا ہے تم

خود مجھ سے ملنا نہیں چاہتے۔ کیا تم میری پچھلی غلطیوں کو معاف نہیں کرو گے؟"

"جب مجھے میرے تمام حقوق مل جائیں گے' دنیا مجھے ایک ہوشمند انسان کی حیثیت سے تسلیم کرتی رہے گی اور میرے اس دشمن چچا کا پول کھل جائے گا تو میں آپ سے ضرور ملاقات کروں گا۔"

"بیٹے! ایک بات سچ سچ بتاؤ' کیا تمہاری وہ پیش گوئی درست ہے؟"

اگرچہ وہ درست نہیں تھی تاہم انٹیلی جنس کے آفیسر صمد بخاری نے کاشف کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ اسے درست کہے اور کبھی کسی کے پوچھنے پر پیش گوئی کے وہی الفاظ دہرائے جو صمد بخاری ایک بار بشیر احمد کے سامنے کہہ چکا ہے۔

کاشف نے اسی ہدایت کے مطابق کہا۔ "آپ جانتی ہیں' بچپن سے اب تک میں نے جھوٹ نہیں کہا۔ جو کہتا ہوں' کیسے درست ہو جاتا ہے؟ یہ میں خود نہیں جانتا۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ میری بات غلط نہیں ہوتی۔"

بیگم کا دل یوں ڈوبنے لگا جیسے نبضیں ڈوبنے لگی ہوں۔ اس نے کہا۔ "امی! مجھے افسوس ہے۔ میں بچپن میں بھی آپ کے لئے منحوس رہا۔ جوانی میں بھی ایسا ہی ہوں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ دوسری بار آپ کا سہاگ اجڑنے کی پیش گوئی کروں۔ جو بات مجھے معلوم ہو چکی تھی' میں اسے چپ چاپ پی جانا چاہتا تھا لیکن بات چھپانے سے حقیقت کبھی نہیں بدلتی۔ موت کا جو وقت کسی کے لئے مقرر ہو چکا ہے' وہ ٹل نہیں سکتا۔"

دوسری طرف سے بیگم نے روتے ہوئے کہا۔ "بے شک موت کا وقت ٹل نہیں سکتا لیکن آدمی کو یہ تو نہ معلوم ہو کہ وہ اب تب میں مرنے والا ہے' آدمی ہر طرح کی پیش گوئیاں سن لیتا ہے مگر موت کی خبر سن کر سکون سے نہیں رہ سکتا۔ موت آنے سے پہلے ہی مر جاتا ہے۔ شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آدمی کو زمین و آسمان کے علوم دیئے۔ ساری کائنات کو تسخیر کرنے کا حوصلہ دیا لیکن آج تک اسے یہ علم نہیں دیا کہ وہ کب مرنے والا ہے۔ وقت سے پہلے کسی ایسی مصیبت سے آگاہ ہونا جس سے نجات ممکن نہ ہو' وہ آگہی عذاب بن جاتی ہے۔"

کاشف نے کہا۔ "اب میں یہ دیکھوں گا کہ اس بار منحوس خبر سن کر آپ مجھ سے کس قدر نفرت کر سکتی ہیں' کیا مجھے آسیب زدہ قرار دے سکتی ہیں؟ کیا دنیا والوں کے

سامنے پاگل ثابت کرسکتی ہیں؟ کیا مجھے کسی کمرے میں بند کرسکتی ہیں؟"

"کاش تم اسی طرح بچے ہوتے تو میں تمہارے منہ پر ٹیپ لگا دیتی' افسوس کہ تم بڑے ہوگئے ہو۔ اتنے بڑے کہ منیر ٹیکسٹائل ملز کے مالک بننے والے ہو۔ کروڑوں کی جائیداد تمہارے قدموں میں ہوگی۔"

"امی! یہی تو افسوس کی بات ہے۔ ماں باپ یہ بھول جاتے ہیں کہ جو آج بچہ ہے وہ کل جوان ہوگا' جو آج ان کے سامنے بے بس ہے اور وہ آسانی سے اس کے منہ پر ٹیپ لگاسکتے ہیں' اسے کمرے میں بند کرسکتے ہیں۔ وہی کل جوان ہوکر ان کا منہ بند کرسکتا ہے' اپنے بزرگوں کو بے دست و پا بنا سکتا ہے۔ آپ جیسی مائیں اپنے بچوں کو مستقبل کا ہٹلر بنا دیتی ہیں۔"

"میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتی' التجا کرتی ہوں۔ جہاں تم نے اپنی پیش گوئی کی ہے وہاں یہ بھی بتادو کہ دو ماہ گزر چکے ہیں تمہاری پیش گوئی پوری کیوں نہیں ہوئی؟"

"آپ نے میری پیش گوئی پر غور نہیں کیا۔ اب اچھی طرح غور سے سنیں۔ میں نے کہا ہے جس وقت آپ کھڑکی کے سامنے فرش پر بیٹھی ہاتھوں کی چوڑیاں ایک ایک کرکے توڑ رہی ہیں' اس وقت باہر موسلا دھار بارش ہورہی ہے' بادل گرج رہے ہیں اور بجلیاں چمک رہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا سہاگ' برسات کے موسم میں اجڑے گا۔"

بیگم کی اوپر کی سانس اوپر رہ گئی۔ پھر وہ جلدی سے بولیں۔ "کیا برسات کے موسم میں؟ مگر اس کے لئے تو ابھی کم از کم سات آٹھ مہینے ہیں۔ اتنے دنوں میں ان کی حالت کیا سے کیا ہوجائے گی۔ وہ کیسے زندہ رہیں گے؟ میں انہیں دیکھتی ہوں تو دیکھا نہیں جاتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہر لمحہ اپنے آس پاس موت کو دیکھ رہے ہوں۔ وہ ضد کرنے پر کھانا کھاتے ہیں جیسے زہر کھا رہے ہوں۔ بڑی مشکل سے انہیں سلایا جاتا ہے۔ وہ ایسے سوتے ہیں جیسے پھر کبھی آنکھ نہیں کھول سکیں گے۔ آہ تم نے کیسے عذاب میں مبتلا کردیا ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ ریسیور رکھ دیا۔ ساحرہ نے پوچھا۔ "تمہاری امی تم سے ملنے کی ضد کررہی ہوں گی۔"

کاشف نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "نہیں' انہیں مجھ سے زیادہ اپنے سہاگ کی

سلامتی کی فکر ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی پھر فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

"ہیلو!"

دوسری طرف سے بیگم کی آواز سنائی دی۔ وہ غصے اور نفرت سے بول رہی تھیں۔

"تم اپنی ماں کے دشمن بن گئے ہو بات پوری کئے بغیر ریسیور رکھ دیتے ہو۔ مجھ سے باتیں کرنا تک گوارا نہیں ہے۔"

"کیا اب بھی کچھ باتیں باقی رہ گئی ہیں؟"

"ہاں' رہ گئی ہیں۔ تم نے ہمیں پیش گوئی کے عذاب میں مبتلا کردیا ہے۔ میں جانتی ہوں جو تم نے کہہ دیا ہے' وہ پتھر کی لکیر ہے۔ جیسا اب تک ہوتا آیا ہے' وہی ہوگا اور میں اجڑ جاؤں گی لیکن یاد رکھو اس بار میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔ اب تک ماں بن کر صرف تمہیں.......... گالیاں دیتی رہی' کوستی رہی یا تمہیں سزا کے طور پر کمرے میں بند کیا.........."

کاشف نے لقمہ دیا۔ "اور سزا کے طور پر پاگل خانے بھجوادیا۔"

وہ غصے سے چیخ کر بولیں۔ "تم اس سے بھی بدترین سزا کے مستحق ہو لیکن تم نہیں جانتے۔ دنیا کی سب سے بدترین سزا ماں کی بددعا ہے۔ میں ابھی ریسیور رکھتے ہی سجدے میں گر پڑوں گی اور گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گی کہ جس طرح تم نے مجھے ہمیشہ آگہی کے عذاب میں مبتلا کیا ہے اور اب بھی کررہے ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہیں اس عذاب میں مبتلا کرے مجھے یقین ہے' ماں کے دل سے نکلی ہوئی آہ عرش تک پہنچتی ہے۔ تم جلد ہی ایسے عذاب میں مبتلا ہوگے ضرور مبتلا ہوگے۔"

یہ کہتے ہی ہچکیاں سنائی دیں۔ پھر بلک بلک کر رونے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی ریسیور رکھ دیا گیا۔ کاشف تھوڑی دیر تک ریسیور تھامے گم صم کھڑا رہا۔

ساحرہ نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

وہ چونک گیا۔ اس نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔ "امی بددعا دے رہی ہیں۔"

ساحرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کیا تم بددعا پر یقین رکھتے ہو؟"

"جب دعا لگتی ہے تو بددعا بھی لگتی ہی ہوگی اور ایسے حالات میں کہ میں نے کوئی

پیش گوئی نہیں کی۔ محض اپنے ظالم چچا کو نفسیاتی مریض بنانا مقصود ہے۔ آہ' میں پریشان تو نہیں ہوں' بس سوچ رہا ہوں' میں جو تصور میں دیکھتا ہوں' اسے بیان کرتا ہوں۔ وہ بات پوری ہوجاتی ہے اور ماں جو تصور میں نہیں دیکھتی لیکن دل کی گہرائی سے کوئی بد دعا دیتی ہے تو کیاوہ بھی پیش گوئی کی طرح پوری ہوتی ہے؟"

☆------☆------☆

بشیر احمد کی حالت قابلِ دید تھی۔ اب وہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ داڑھی بڑھ گئی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ دونوں طرف سے گال بھی پچک گئے تھے۔ وہ ذرا سی آہٹ سن کر یوں دیدے پھاڑ کر دیکھتا تھا جیسے موت کو پہچان رہا ہو۔ اس کی وحشت زدہ آنکھیں دیکھ کر دہشت طاری ہونے لگتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی جنون میں اٹھے گا اور سامنے والے کی گردن دبوچ لے گا۔

اگرچہ بنیادی خوف یہی تھا کہ اگلا موسم برسات اس کی زندگی کا آخری موسم ہوگا۔ اس کے علاوہ ہر طرف سے محرومیاں اور مجبوریاں اسے مار رہی تھیں۔ آمدنی کے تمام ذرائع ختم ہوچکے تھے۔ مرحوم منیر احمد کی جائیداد سے اب تک ایک پیسہ بھی نہیں مل سکا تھا اور وہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ کہیں سے چار پیسے کما کر لاتا۔ بیگم پریشان رہتی تھی۔ کبھی کبھی فاقے کی نوبت آجاتی تھی۔ پھر یہ کہ مقدمہ بازی انہیں اور پریشان کر رہی تھی۔ گھر کا ایک ایک سامان بیچ کر وکیل کو فیس دی جاتی تھی۔ ان کا وکیل ذرا ہوشیار تھا اس لئے مقدمے کو طول دے رہا تھا ورنہ اب تک بیگم سلاخوں کے پیچھے نظر آتیں۔ وہ چاہتی تھیں' کسی طرح برسات کا موسم گزر جائے' اس کے شوہر کی زندگی یا موت کا کوئی فیصلہ ہوجائے تو پھر وہ عدالت کے ہر فیصلے کو تسلیم کرے گی۔ وہ اس سے پہلے اپنے شوہر کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

پیش گوئی کے تیسرے مہینے میں ہی اس پر دورے پڑنے لگے۔ کبھی کبھی وہ نیند میں چونک کر اٹھ جاتا تھا۔ پھر یکبارگی چیخ چیخ کر کہنے لگتا تھا۔ "میں موت سے نہیں ڈرتا۔ مجھے ڈرایا جارہا ہے۔ میں کوئی بچہ نہیں ہوں۔" پھر وہ اپنے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر بڑے ہی تشدد سے کھینچنے لگتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔ "میرے دماغ کو کمزور بنادیا گیا ہے۔ اسی لئے میں پیش گوئی کے متعلق سوچتا رہتا ہوں۔ نہیں سوچنا چاہتا پھر بھی دماغ میں بات آتی

رہتی ہے۔ میں جانتا ہوں' کسی کو پہلے کس طرح نیم پاگل بنایا جاتا ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ مکمل پاگل ہوجاتا ہے لیکن میں پاگل نہیں بنوں گا' میں ہوشمند ہوں۔"

پاگلوں کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہوشمند کہتے ہیں ورنہ جو ہوشمند ہوتے ہیں' انہیں کبھی ہوشمندی کا دعویٰ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ تین ماہ کے بعد وہ اپنے سینے کو پیٹ پیٹ کر موت کو للکارنے لگا۔ "میں موت سے نہیں ڈرتا۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ موت ایک دن آتی ہے' سب کو آتی ہے۔ مجھے بھی آنے والی ہے فرق کیا پڑتا ہے۔ میں نہیں ڈرتا' آنے دو موت کو۔"

بے شک وہ للکار رہا تھا۔ جو لوگ جوانمردی سے موت کو للکارتے ہیں اور سر سے کفن باندھ کر میدانِ عمل میں آتے ہیں۔ پھر وہ نہیں ڈرتے لیکن جوانمردی کے لئے اندر سے مضبوطی لازمی ہے اور اندر سے اس کے اعصاب کمزور ہوگئے تھے۔ دماغ اس قابل نہیں رہا تھا کہ وہ مستقل مزاجی کا حامل ہوتا۔

ابھی برسات کا موسم دور تھا۔ صرف چار ماہ گزرے تھے کہ اس کا جنون شدت اختیار کرنے لگا۔ اب اس نے چیلنج کیا۔ "میں پیش گوئی کو بدل کر رکھ دوں گا۔ جس طرح اس نے پیش گوئی کی ہے۔ اس طرح کبھی پوری نہیں ہونے دوں گا۔ میرے پاس بھی دماغ ہے' میں بھی تدبیر سوچ سکتا ہوں۔"

اس پر ایسے دورے پڑتے تھے کہ اسے سنبھالنا مشکل ہوجاتا تھا۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق بیگم رات کے وقت اسے نیند کی تین گولیاں دیتی تھیں تب کہیں اسے سکون سے نیند آتی تھی۔ وہ رات کے وقت دروازے کو مقفل کردیتی تھیں۔ چابیاں اپنے پاس رکھتی تھیں تاکہ وہ جنون کی حالت میں کہیں باہر نہ چلا جائے۔ دن کے وقت جب وہ باہر جاتی تو دروازے کو لاک کر دیتی تھی۔ ایک دن وہ عدالت سے دوپہر کو واپس آئی' دروازہ کھول کر اندر پہنچی تو دیکھا' وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اسے ذرا اطمینان ہوا۔ وہ گھر کی صفائی اور کھانا پکانے میں مصروف ہوگئی۔ شام کو پھر بیڈ روم میں آکر دیکھا وہ اسی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ تب ماتھا ٹھنکا۔ وہ جلدی سے قریب آئی۔ اس نے اس کے ہاتھ کو چھو کر دیکھا۔ اس کا جسم قدرے ٹھنڈا محسوس ہوا۔ اس نے آواز دی' جھنجوڑا۔ پھر اس کے سینے پر سر رکھ کر دل کی دھڑکنیں سننے کی ناکام کوشش کی۔ تب پتا چلا کہ وہ مرچکا ہے۔

اس لمحے وہ رونا بھول گئی۔ پیش گوئی کے پہلے لمحے سے لے کر اب تک جسے وہ روتی آئی تھی اور اس کے دماغ کے کسی خانے میں یہ بات تھی کہ جب تک وہ پیش گوئی پوری نہیں ہوگی یا غلط ثابت نہیں ہوگی اس وقت تک قرار نہیں آئے گا اور اگر غلط ثابت نہ ہوتی تو وہ روتی ہی رہے گی۔ اب وہ درست ثابت ہوگئی تھی۔ اس کے دماغ سے جیسے کوئی انجانا سا بوجھ اتر گیا تھا۔ جو ہونی تھی' آخر ہوگئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سرہانے ہی چھوٹی سی میز پر ایک شیشی کھلی پڑی تھی۔ اس میں سے کچھ گولیاں باہر بکھری ہوئی تھیں۔ وہ لپک کر ادھر گئی۔ اس شیشی میں خواب آور گولیاں رکھی رہتی تھیں۔ اسے کبھی دو' کبھی تین کھلائی جاتی تھیں۔ اس کے بعد ہی وہ کسی حد تک سو سکتا تھا لیکن آج جانے اس نے کتنی گولیاں کھالی تھیں۔ وہ وہاں سے دوڑتے ہوئے باہر گئی۔ محلے کے ڈاکٹر کو جاکر اطلاع دی۔ ڈاکٹر نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "میں اس کیس میں ملوث نہیں ہونا چاہتا' ممکن ہے۔ مرڈر کیس ہو۔ پہلے پولیس والوں کو اطلاع دیں اس کے بعد میں وہاں آؤں گا۔"

بہرحال وہ بات' پولیس والوں تک پہنچی پولیس والوں سے صمد بخاری تک پہنچی۔ اس نے وہاں آکر بشیر احمد کی لاش دیکھی' پھر کہا۔ "اگر اس نے خودکشی کی ہے تو یقیناً اپنے پیچھے کوئی تحریر چھوڑی ہوگی۔"

کمرے میں پولیس انسپکٹر' چار سپاہی' ایک ڈاکٹر' بیگم اور صمد بخاری تھے۔ انسپکٹر نے بیگم سے پوچھا۔ "صبح تم اپنے شوہر کو چھوڑ کر کہاں گئی تھیں؟"

"آج عدالت میں پیشی تھی' میں وہاں گئی تھی۔"

"جانے سے پہلے تمہارے اور بشیر احمد کے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں؟ کوئی جھگڑا ہوا تھا؟"

"نہیں' جھگڑا تو نہیں ہوا تھا مگر وہ چڑچڑے ہوگئے تھے۔ بات بات پر ناراض ہوجاتے تھے' غصہ دکھاتے تھے۔"

"آج انہوں نے کس بات پر غصہ دکھایا تھا؟ کیا کہہ رہے تھے؟"

بیگم نے ایک ٹیپ ریکارڈر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آج میں یہ ریکارڈر بیچنے جارہی تھی۔ ہم ایسے تنگ دست ہوگئے ہیں کہ گھر کا سامان بیچ کر گزارہ ہوتا ہے۔ انہوں

نے کبھی کسی سامان کو بیچنے سے انکار نہیں کیا لیکن ٹیپ ریکارڈر پر اعتراض کیا۔ کہنے لگے' آج اسے رہنے دو کل چاہو تو جاکر بیچ دینا۔"

صمد بخاری نے چونک کر پوچھا۔ "کیا صرف آج ہی بیچنے کے لئے منع کیا تھا؟ دوسرے دن بیچنے پر راضی تھا؟"

"جی ہاں' وہ یہی کہہ رہے تھے کہ میں اسے آج گھر سے نہ لے جاؤں۔"

صمد بخاری تیزی سے چلتا ہوا ٹیپ ریکارڈر کے پاس پہنچا پھر اس نے اس میں لگے ہوئے اسپول کو دیکھا۔ ٹیپ ریکارڈر کے تار کو سوئچ بورڈ سے منسلک کرنے کے بعد ٹیپ کو ریوائنڈ کیا۔ جب وہ ریوائنڈ ہوچکا تو اسٹاپ کرنے کے بعد اسے آن کیا۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ سب لوگ سوالیہ نظروں سے کبھی صمد بخاری کو اور کبھی ٹیپ ریکارڈر کو دیکھتے رہے۔ پھر اس میں سے بشیر احمد کی آواز ابھرنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"اس لڑکے نے میری زندگی کو موت سے بدتر بنا دیا ہے۔ پہلے اس کی ماں اسے منحوس کہتی تھی۔ آسیب زدہ کہتی تھی تو میں ہنستا تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا لیکن اب یقین ہوچکا ہے۔ یہ جو کہتا ہے' وہی ہوتا ہے لیکن میں اس طرح ہر لمحہ سہم سہم کر مرنا نہیں چاہتا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت سنبھالنے کی کوشش کی لیکن جس شخص کو اپنی موت کا یقین ہوجائے اسے پھر تقدیر بھی نہیں سنبھال سکتی۔ میں سمجھتا ہوں کینسر کے مریض ایک مخصوص میعاد سے زیادہ زندہ رہ سکتے ہیں لیکن وہ اسی لئے جلد مرجاتے ہیں کہ انہیں اپنی موت کا یقین ہوجاتا ہے۔ یقیناً وہ کینسر سے ہی مرتے ہیں لیکن موت کا یقین انہیں کچھ پہلے ہی مار دیتا ہے۔ یہ میرا خیال ہے ضروری نہیں کہ کوئی مجھ سے اتفاق کرے۔

میں نے لمحہ لمحہ مرتے ہوئے آخر فیصلہ کرلیا کہ ایک ہی بار مرجانا بہتر ہے۔ میں اس طرح اس منحوس لڑکے کی پیش گوئی کو ٹھکرا سکتا ہوں۔ وہ کہتا ہے برسات کے موسم میں میری موت ہوگی۔ میں کہتا ہوں ابھی ہوگی اور اسی لمحے ہوگی۔

یہ لو' میں شیشی کھول کر خواب آور گولیاں نکال رہا ہوں۔ جتنی میری مٹھی میں آئیں گی' اتنی حلق سے اتار لوں گا میں نے کھڑکی سے باہر دیکھ لیا ہے۔ نہ بادل گرج رہے ہیں' نہ بجلیاں چمک رہی ہیں اور نہ ہی بارش ہورہی ہے۔ میں اس کمینے کی پیش گوئی کو

پوری طرح جھٹلا رہا ہوں۔"

تھوڑی دیر کے لئے ٹیپ ریکارڈر خاموش رہا۔ اسپول چلتا رہا۔ پھر بشیر احمد کا قہقہہ سنائی دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "انتظار ختم ہوگیا۔ میں نے موت کو اپنے اندر اتار لیا ہے۔ اب اپنے جسم کے قلعے سے باہر نہیں جانے دوں گا۔ موت اگر میرے اندر سے پرواز کرے گی تو میری زندگی کے ساتھ پرواز کرے گی۔

آہ' کتنا سکون مل رہا ہے۔ اب جب کہ مجھے اپنی موت کا بالکل یقین ہوگیا ہے تو میں اپنے ان تمام جرائم کا اعتراف کرتا ہوں' جو قانون کی نظروں سے اب تک چھپے ہوئے ہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ منیر احمد کا قاتل میں ہوں۔ میں نے ہی اس کی کار کے پہیے کے نٹ بولٹ ڈھیلے کئے تھے۔ میں اپنی بیوی کا قاتل ہوں۔ میں نے اس لڑکے کی پیش گوئی سے فائدے اٹھائے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ اپنی ماں کی چوڑیوں کے ٹوٹنے کی باتیں کر رہا ہے تو میں نے تدبیر سوچ لی۔ سوچا کہ جب بھی بھائی جان اس گھر سے باہر کار میں بیٹھ کر جائیں گے تو پھر واپس نہیں آسکیں گے۔ دوسری بار شاید کاشف پیش گوئی نہ کرتا لیکن وہ اپنے ایک ہم عمر ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ اسے تصور میں کیک کاٹنے کا ایک جاقو دکھائی دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک عورت کی لاش نظر آتی ہے اور یہ بات وہ اپنی امی سے نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ سب اسے منحوس کہتے ہیں اور اس کی پیش گوئی سے ڈرتے ہیں۔ یہ بات میں نے چھپ کر سن لی تھی۔ میں نے اس موقع سے بھی فائدہ اٹھایا اور اپنی بیوی کو قتل کرنے کے بعد جس چاقو سے قتل کیا تھا' اسے کاشف کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ وہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں تھا۔ کیوں کہ میں نے اسے وہی ہیجان انگیز انجکشن لگادیا تھا۔

ہاں میں یہ بھی اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اسے پاگل بنائے رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ جب بھی مجھے یا پاگل خانے کے میرے اپنے ساتھیوں کو شبہ ہوتا کہ اسے نارمل قرار دیا جائے گا یا کوئی آفیسر سنجیدگی سے اس کے متعلق تحقیقات کرے گا تو ہم میں سے کوئی موقع پاکر اسے ہیجان انگیز انجکشن لگا دیتا تھا۔ اس طرح ہم اسے پاگل ثابت کرتے آرہے تھے۔"

چند لمحوں تک پھر ٹیپ ریکارڈر خاموش رہا' اسپول چلتا رہا۔ اس کے بعد پھر اس کی

لڑکھڑاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "لل.......... لیکن یہ کیا؟ جب میں مر رہا ہوں تو میرا دماغ روشن ہو رہا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ آرہا ہے۔ اگر وہ پیش گوئی کرتا تھا اور اس کی بات سچ ہوتی تھی اور اسے وقت سے پہلے بہت کچھ معلوم ہوجاتا تھا تو اسے یہ کیوں نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ہم کس وقت اسے ہیجان انگیز انجکشن لگانے والے ہیں؟

ہاں' اسے کبھی یہ معلوم نہ ہوسکا اور ہم اسے انجکشن لگادیتے تھے۔ پھر یہ کہ پیش گوئی ہے کیا بلا؟ اور یہ بالشت بھر کا چھوکرا بھلا کیا پیش گوئی کرے گا؟ اس نے کہا تھا کہ اس نے اپنی ماں کی چوڑیوں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ واقعی اس کی ماں بیوہ ہوجاتی' اس کا باپ مرجاتا۔ یہ تو میں تھا جس نے اس کے باپ کو مارا تھا۔ اسی طرح اس نے ہاتھ میں کیک کاٹنے کا چاقو دیکھا تھا اور کسی عورت کی لاش دیکھی تھی۔ کوئی ضروری تو نہیں تھا کہ وہ میری بیوی یعنی کاشف کی چچی کی لاش ہوتی۔ وہ تو میں نے اس کی چچی کو قتل کیا تھا۔ وہ پاگل کا بچہ کہہ سکتا ہے کہ یہ اس کی پیش گوئیاں تھیں لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ سب میرے قاتلانہ منصوبے تھے۔

"نن.......... نہیں' میں مرنا نہیں چاہتا۔ مجھ سے بڑی نادانی ہوئی۔ میں نے یہ گولیاں کھا کر بہت بڑی غلطی کی.........."

اس کے ساتھ ہی ابکائیوں کی آواز سنائی دی۔ وہ قے کر رہا تھا اور ساتھ ہی پاگلوں کی طرح بڑبڑاتا جارہا تھا۔ "میں مرنا نہیں چاہتا.......... مجھے یہ عقل پہلے کیوں نہیں آئی کہ اس نے برسات کے موسم میں مرنے کے لئے کہا ہے تو یہ اس کی پیش گوئی ہے لیکن میں وقت سے پہلے مر رہا ہوں۔ تو یہ میری خودکشی ہوگی۔ او خدایا! پہلے میری سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آئی' مجھے بچاؤ! میں مرنا نہیں چاہتا۔"

قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر دھپ کی آواز کے ساتھ خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد کراہنے کی آواز سنائی دی۔ وہ ٹیپ ریکارڈر پلنگ کے سرہانے رکھا ہوا تھا۔ اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ بشیر احمد آخری وقت بستر پر دھپ سے گر پڑا تھا اور وہیں کراہ رہا تھا۔ شاید اٹھنے کی کوشش کر رہا ہو لیکن ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے ہوں اور وہ اٹھنے کے قابل نہ رہا ہو۔ اس کے بعد اس کی عجیب بے ہنگم سی آوازیں آتی رہیں۔ اس کے بعد وہ آوازیں آہستہ آہستہ دم توڑتی رہیں۔ پھر ٹیپ ریکارڈر خاموش ہوگیا۔ اسپول گھومتا رہا لیکن کوئی

آواز سنائی نہ دی۔

صمد بخاری نے ٹیپ کو اسٹاپ کیا۔ اس کے بعد ریوائنڈ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ بشیر احمد کی تائید میں بھی کرتا ہوں۔ ایک لڑکا بچپن سے صحیح پیش گوئی کرتا آئے' یہ بات ناقابل قبول ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ بشیر احمد کی موت کاشف کی پیش گوئی کے مطابق نہیں ہوئی اور نہ ہی کاشف نے کوئی سچی پیش گوئی کی تھی۔ اس نے ہماری ہدایت کے مطابق ایک جھوٹ بات کہہ دی تھی۔

بیگم رو رہی تھی۔ یہ بات سنتے ہی اس نے چونک کر صمد بخاری کو دیکھا۔ پھر غصے سے چیختے ہوئے بولی۔ ”خدا تم لوگوں کو غارت کرے۔ میں اس لڑکے کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ میرے دل سے بددعائیں نکلتی رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ اسے بھی کوئی ایسا ہی منحوس دن دکھائے اور اسے آگہی کے عذاب میں مبتلا کرے۔“

صمد بخاری نے اس ٹیپ کو ریکارڈر سے نکال لیا۔ بیگم چیختی چلاتی اور بد دعائیں دیتی رہی۔ ہر شخص ایک نہ ایک دن اپنے اچھے یا برے انجام کو پہنچتا ہے۔ بشیر احمد اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا کچھ عرصے بعد بیگم بھی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دی گئی۔

☆======☆======☆

تقریباً ایک سال کے بعد کاشف اپنے والد مرحوم کی دولت' جائیداد اور کاروبار کا مالک و مختار بن گیا۔ اس کے بعد دو برس تک وہ اپنے کاروبار میں بری طرح مصروف رہا لیکن مصروفیات کے باوجود ساحرہ سے ملنے کی فرصت ضرور ملتی رہی۔ وہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ صبح و شام ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ ایک دوسرے کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتے رہتے تھے۔ ان کی محبت' ان کی عمر کے ساتھ ساتھ جوان ہوتی جارہی تھی۔ آخر تین برس کے بعد ان کی شادی ہوگئی۔

ساحرہ پھولوں کی سیج پر دلہن بنی بیٹھی ہوئی تھی۔ کاشف نے کمرے میں آکر اسے دیکھا اور بے اختیار مسکرانے لگا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ پھر اس کے گھونگھٹ کو اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”ساحرہ!“ تمہیں یاد ہے' اب سے تین برس پہلے میں نے پاگل خانے میں دیکھتے ہی کہا تھا۔ تم میری دلہن بنو گی۔ دیکھو! تم دلہن بنی میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہو۔“

دلہن کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ آہستگی سے بولی۔ ”یہ محض اتفاق ہے۔ تم نے پہلی بار دیکھا' میں تمہاری نگاہوں میں سما گئی۔ تم نے مجھے دل سے پسند کیا اور وہ ارادہ حسن اتفاق سے پورا ہوگیا۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو! کیا میں آج تک جو کہتا رہا وہ حسن اتفاق سے پورا ہوتا رہا؟“

”جی ہاں' اس کے ثبوت مل چکے ہیں' تمہارے چچا کی موت تمہاری پیش گوئی کے مطابق نہیں ہوئی۔“

”میں نے وہ پیش گوئی نہیں کی تھی۔“

”اچھا چلو' اپنی چچی کے قتل کی بات ہی لے لو۔ تم نے کسی مقتولہ عورت کو تصور میں دیکھا تھا' اپنی چچی کو نہیں دیکھا تھا۔ تمہارے چچا نے تمہاری اس پیش گوئی سے فائدہ

اٹھالیا اور راستے کے ایک کانٹے کو دور کردیا۔ اسی طرح تمہارے چچا نے تمہارے والد کو حادثاتی موت کا شکار بنادیا۔"

"ساحرہ! تم میری بیوی ہوکر کیسی باتیں کر رہی ہو۔ کیا تمہیں اپنے شوہر کی باتوں پر اعتماد نہیں ہے۔ یقین کرو' میں نے پاگل خانے کی سلاخوں کے پیچھے جس قاضی کی آواز سنی تھی۔ آج وہی آواز میرے کانوں میں کہہ رہی تھی کہ کاشف منیر ولد منیر احمد تمہارا نکاح شرعی احکام کے مطابق ساحرہ بیگم دختر قدیر بیگ کے ساتھ.........."

وہ آگے نہ کہہ سکا۔ ساحرہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "دیکھو کاشف! یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ سبھی کا نکاح اسی طرح پڑھایا جاتا ہے۔ تم نے پہلی بار مجھے دلہن کے روپ میں دیکھا تو تمہارے کانوں میں وہی نکاح پڑھانے کی آواز گونجنے لگی۔ اگر کوئی محبوبہ کو دلہن کے روپ میں دیکھے اور ایک دن اسے اپنی دلہن بنالے تو اس کا شمار پیش گوئی کرنے والوں میں نہیں ہوتا۔"

وہ ناراض ہوکر اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ دوسرے طرف صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ ساحرہ نے گھونگھٹ کی اوٹ سے دیکھ کر پوچھا۔ "تم وہاں کیوں چلے گئے؟" اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دلہن نے پھر پوچھا۔ "کیا ناراض ہوگئے؟" وہ خاموش رہا۔ "کاشف! ہماری ازدواجی زندگی کی یہ پہلی رات ہے۔ ہم آج سے بہت ہی خوشگوار زندگی کی ابتدا کر رہے ہیں۔ ہمیں اب مسکراتے رہنا چاہئے' ناراضگی اچھی نہیں لگتی۔"

"تم نے ہی میری مسکراہٹ ختم کردی۔ کیا ایک شوہر یہ برداشت کرسکتا ہے کہ بیوی اسے جھوٹا سمجھے؟"

"میں تمہیں جھوٹا نہیں کہہ رہی ہوں۔"

"سچا بھی نہیں سمجھ رہی ہو۔"

"میں تمہیں سچا نہیں سمجھوں گی تو اور کسے سمجھوں گی۔ تم نے پہلی ملاقات میں کہا تھا' مجھے اپنی دلہن بناؤ گے۔ یہ تمہاری سچائی ہے کہ تم نے اپنی بات پوری کی۔ چلو جو کچھ میں نے کہا' وہ میری نادانی تھی۔ سچ مچ مجھے ان ہی باتوں پر یقین کرنا چاہئے جو تمہاری زبان سے نکلتی ہیں۔ آئندہ میں تمہیں ناراض نہیں ہونے دوں گی۔"

وہ خوش ہوگیا۔

خوشی نعمت ہے اور غم لعنت ہے۔ انسان کی زندگی میں لعنت کا حصہ زیادہ ہے اور نعمت کا کم۔ شاید اسی لئے انسان آج تک نعمتوں کو گلے لگانے کا اتنا آسان طریقہ دریافت نہیں کرسکا جتنے آسان طریقے سے زندگی کی لعنتیں گلے پڑجاتی ہیں۔ شادی کے دس ماہ بعد ساحرہ کے والد قدیر بیگ کا انتقال ہوگیا۔ ساحرہ کو اپنے باپ سے ماں کا بھی بھرپور پیار ملا تھا۔ اس نے باپ کی زندگی میں کبھی ماں کی کمی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ یقیناً بہت دنوں تک غمزدہ رہی۔ اپنے باپ کو یاد کرکے کبھی کبھی روتی رہی لیکن ماں باپ خواہ کتنے ہی عزیز ہوں' عورت شوہر کی خاطر انہیں ایک دن چھوڑ دیتی ہے۔ ساحرہ کو بھی کاشف کی محبت نے رفتہ رفتہ بہلا دیا۔

دن رات گزرتے گئے۔ شادی کی پیش گوئی پوری ہونے کے بعد تقریباً دو برس تک کاشف کے تصور میں ایسا کوئی واقعہ نہیں آیا جسے وہ اپنے یا کسی دوسرے کے مستقبل سے وابستہ کرسکتا۔ دوسرے لفظوں میں اس نے ساحرہ کی محبت میں خود کو اتنا گم کردیا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں بھی آنکھوں کے سامنے وہی ہوتی تھی۔ جب وہ ہی وہ ہو تو پھر بھلا کسی اور کا تصور کیسے قائم ہوسکتا تھا؟

دو برس کے بعد اسے کاروبار کے سلسلے میں فیصل آباد جانا پڑا وہ صبح سے شام تک ساحرہ کی جدائی برداشت نہیں کرتا تھا۔ ساحرہ بھی فون کے ذریعے دن میں ایک آدھ بار اس سے رابطہ قائم رکھتی تھی۔ عام طور پر شوہر شادی کے ایک آدھ سال بعد ہی ذرا بیویوں سے دور بھاگنے لگتے ہیں۔ وہ اپنی شریکِ حیات سے محبت ضرور کرتے ہیں لیکن ذرا دور دور سے۔ کاشف کی بات کچھ اور تھی۔ اسے زندگی میں پہلی بار کسی سے محبت ملی تھی تو وہ ساحرہ تھی۔ رشتوں کی اپنائیت' محبت اور اعتماد سب کچھ ساحرہ کی ذات سے تھا۔ ورنہ جنم دینے والی ماں نے بھی اسے پاگل خانے بھیج دیا تھا۔ لہٰذا وہ اگر ساحرہ کو دیوانہ وار چاہتا تھا تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔

وہ فیصل آباد جانا نہیں چاہتا تھا۔ ساحرہ نے ضد کی' اسے جانا چاہئے۔ وہاں ملک کے تمام ٹیکسٹائل ملز کے مالکان کی اہم میٹنگ تھی اور اس میں کاشف کی شرکت ضروری تھی۔ ساحرہ نے کبھی روٹھ کر اور کبھی محبت سے منا کر اسے فیصل آباد بھیج ہی دیا۔ وہ صبح کی فلائیٹ سے گیا۔ میٹنگ شام کو ہونے والی تھی۔ اس نے سوچا' رات کی کسی فلائیٹ سے

واپس آجائے گا لیکن چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر میٹنگ اگلے دن صبح تک ملتوی کردی گئی۔ لہٰذا اسے اس رات فیصل آباد میں رہنا پڑا۔

اس نے ٹرنک کال کے ذریعے ساحرہ کو موجودہ حالات سے آگاہ کیا۔ اس سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔ پھر ریسیور رکھ دیا۔ باتیں کرنے کے دوران بھی وہ اس کے سامنے مسکرا رہی تھی ریسیور رکھنے کے بعد بھی وہ نگاہوں کے سامنے موجود تھی لیکن وہ اپنی خیالی ساحرہ کو چھو نہیں سکتا تھا۔ رات کا کھانا کھانے سے پہلے وہ ہوٹل کے کمرے میں تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کمرے کی روشنی کو ذرا مدہم کرلیا تھا تاکہ نیم تاریکی میں ساحرہ کا تصور زیادہ سے زیادہ واضح ہوسکے۔ خیال پر حقیقت کا گمان ہوسکے۔ ایسے وقت میں اس نے تصور کو مستقبل کا آئینہ بنتے دیکھا۔

اس نے دیکھا' ساحرہ اپنے بیڈ روم میں سو رہی ہے۔ کمرے کے باہر دور کہیں سے ٹن' ٹن کی آواز آرہی ہے جیسے کوئی گھڑیال رات کو گھنٹہ بجاکر صحیح وقت بتا رہا ہو۔ کاشف اس ٹن' ٹن کی آواز کو گننے لگا۔ بارہ تک گنتی ہوئی۔ اس کے بعد آواز بند ہوگئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آدھی رات گزر چکی ہے اور ساحرہ محو خواب ہے۔ اسی وقت سیاہ لباس میں کوئی نظر آیا۔ اس کا چہرہ بھی سیاہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ وہ ساحرہ کے قریب آرہا تھا۔ کاشف کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ چیخ کر ساحرہ کو بیدار کرے لیکن وہ خیالی ساحرہ کو کیسے بیدار کرسکتا تھا۔ وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے مجبور اور بے بس تماشائی کی طرح وہ منظر دیکھنے لگا۔ سیاہ نقاب پوش نے قریب پہنچتے ہی ساحرہ کے منہ اور ناک پر ہاتھ رکھا' اتنے زور سے ہاتھ رکھا کہ وہ نیند سے بیدار ہونے کے باوجود خود کو نہ چھڑا سکی۔ اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے مچلنے لگی' تڑپنے لگی جس طرح مچھلی پانی سے نکل کر پھڑکتی رہتی ہے پھر اس کا جسم دھیرے دھیرے ساکت ہوتا چلا گیا۔

کاشف پر جیسے سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر مستقبل کے آئینے میں جھانک رہا تھا۔ ساحرہ بے حس و حرکت بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ اب وہ سیاہ نقاب پوش نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کی جگہ چند ہاتھ نظر آئے۔ وہ ساحرہ کو چھو کر' ٹٹول کر دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے اس پر ایک سفید چادر ڈال دی۔

کاشف کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ساحرہ کے ساتھ ساتھ وہ

بھی جان سے جاچکا ہے۔ اب وہ چند ہاتھ اس کی جانِ حیات کو اٹھاکر فرش پر لے آئے تھے۔ کسی نے قالین کو ایک طرف سے الٹ دیا۔ پھر فرش کو اِدھر اُدھر سے ٹھونک بجاکر دیکھنے لگا۔ ایک جگہ وہ ٹھہر گیا۔ جہاں وہ ٹھہر گیا وہاں پھر چند ہاتھ نظر آئے۔ وہ سب مل کر فرش سے ایک بڑی سی چٹان کو سرکا رہے تھے۔ جیسے جیسے وہ چٹان سرک رہی تھی۔ اندر سے ایک تہہ خانہ نظر آرہا تھا۔ ایک زینہ اس تہہ خانے میں اترتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ پھر وہ لوگ ساحرہ کو اس تہہ خانے میں لے گئے۔ وہاں اسے چھوڑ دیا۔ پھر اوپر آکر انہوں نے فرش کے اس خلا کو اس بھاری چٹان سے پُر کردیا۔ قالین کو پھر سیدھا کرکے فرش پر بچھادیا۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اُس کمرے کے فرش کے نیچے تہہ خانہ ہے اور وہاں کسی کی لاش کو چھپا دیا گیا ہے۔

کاشف اپنی جگہ دم بخود بیٹھا ہوا تھا جیسے سانس لینا بھول گیا ہو۔ وہ تہہ خانے کے اندر اپنی ساحرہ کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مستقبل کا آئینہ جو دکھاتا' وہی دیکھ سکتا تھا۔ اس وقت آئینہ دکھا رہا تھا کہ جن لوگوں نے اسے تہہ خانے میں چھوڑ دیا تھا اب وہ وہاں سے جارہے تھے۔ ایک ایک قدم اٹھارہے تھے۔ کاشف کسی ارادے کے بغیر ان قدموں کو گننے لگا۔ گنتے گنتے جب چالیس قدم پورے ہوگئے یعنی وہ لوگ اس تہہ خانے سے چالیس قدم دور چلے گئے تو اچانک ساحرہ کی چیخ سنائی دی۔

وہ ایک دم سے لرز گیا۔ یہ کیا! وہ تو مردہ ہوچکی تھی۔ اسے مردہ سمجھ کر تہہ خانے میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ اب اسے ساحرہ نظر آرہی تھی۔ وہ چیخ رہی تھی۔ "میں کہاں ہوں؟ مجھے یہاں سے نکالو۔ یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

وہ زور زور سے سانس کھینچ رہی تھی جیسے سانس لینے میں تکلیف محسوس ہورہی ہو۔ پھر وہ دوڑتے ہوئے تہہ خانے کے زینے تک آئی' وہاں گھٹن تھی' گرمی تھی' تاریکی تھی۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ زینے کو ٹٹولتے ہوئے' ہانپتے ہوئے اوپر چڑھتی جارہی تھی۔ پھر وہ زینے کی اوپری سیڑھی پر پہنچ گئی۔ جہاں وہ بھاری چٹان رکھی ہوئی تھی۔ وہ اس چٹان کو وہاں سے اٹھانے کی' وہاں سے ہٹانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ کیونکہ وہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ پتا نہیں کتنے ہاتھوں نے اسے اس کی جگہ سے ہٹایا تھا' اسے تہہ خانے میں پہنچایا تھا۔ پھر اس چٹان کو واپس اس کی جگہ رکھ دیا تھا۔ وہ

اکیلی یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے پھر چیخنے لگی۔ "بچاؤ' مجھے بچاؤ کاشف! تم کہاں ہو؟ مجھے یہاں سے نکالو' میں مر رہی ہوں۔ مجھے بچالو.......... میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔"

وہ چیخ رہی تھی۔ ایک ہاتھ سے سر کے بالوں کو نوچ رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اس چٹان کو مار رہی تھی اور آوازیں دیئے جا رہی تھی۔ اسی وقت مستقبل کا آئینہ صاف ہوگیا۔ کاشف کی نگاہوں کے سامنے منظر ختم ہوگیا۔ یوں جیسے آئینہ دھندلا گیا ہو۔

وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس نے کھڑے ہو کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پھر دیکھنے کی کوشش کی لیکن اسے کچھ نظر نہیں آیا' تب وہ دوڑتا ہوا ٹیلیفون کے پاس گیا۔ ریسیور اٹھا کر ہوٹل کے ایکسچینج والوں سے رابطہ قائم کیا۔ ان سے درخواست کی کہ جتنی جلدی ہوسکے کراچی میں اس کے گھر کے نمبر سے رابطہ قائم کیا جائے۔ وہ فوری رابطہ ہونے پر زیادہ سے زیادہ ادائیگی کے لئے تیار ہے۔

پھر اس نے کسی ٹریول ایجنسی کے نمبر طلب کئے۔ اس نمبر پر رابطہ قائم ہوتے ہی اس نے پوچھا۔ "کیا آج رات کراچی کے لئے کوئی فلائٹ ہے؟"

جواب ملا۔ "کل شام سے پہلے کوئی فلائٹ نہیں ہے۔"

اس نے فوراً ریسیور رکھ دیا کیونکہ ساحرہ سے رابطہ قائم ہونے والا تھا۔ وہ بے چینی سے فون کو دیکھنے لگا.......... اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سینکڑوں میل کا سفر ایک پل میں کیسے طے کرلے اور ساحرہ کے پاس پہنچ جائے' ایسا تو اسی صورت میں ہوسکتا تھا کہ جب اس کے پر لگ جاتے اور یہ ممکن نہیں تھا۔

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ کان سے لگایا تو ایکسچینج کے ایک آپریٹر نے اس کا نام پوچھنے کے بعد کہا۔ "آپ ہولڈ آن کریں' رابطہ قائم کرایا جارہا ہے۔"

اس نے جلدی سے کہا۔ "آپریٹر! پلیز لسن ٹو می۔ میری التجا ہے کہ جتنی دیر بات کروں آپ وقت نوٹ کرتے جائیں لیکن رابطہ منقطع نہ کریں جو بھی بل بنے گا میں ابھی ہوٹل والوں کے ذریعے ادا کروں گا۔ دوسری بار آپ میری آئندہ کی کال بک کرلیں اور پلیز ان اوقات میں میرا اسی نمبر پر رابطہ قائم کرا دیں۔ میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔ آپ اس سلسلے میں جو مطالبہ کریں گے' میں اسے پورا کروں گا۔"

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ "آپ آئندہ کس وقت کال بک کرانا چاہتے ہیں؟"

"آپ نوٹ کریں۔ آدھی رات کو گیارہ بج کر پچاس منٹ پر یعنی بارہ بجنے سے دس منٹ پہلے۔ دوسری کال آدھی رات کو دو بجے۔ تیسری کال صبح چھ بجے۔ ان تمام کالوں کے لئے وہی شرط ہے کہ ہم جتنی دیر باتیں کریں' آپ وقت نوٹ کرلیا کریں لیکن ہم سے پوچھے بغیر رابطہ منقطع نہ کریں۔"

آپریٹر سے باتیں کرنے کے بعد ساحرہ کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو کاشف! کیا بات ہے؟"

اس نے پوچھا۔ "تم خیریت سے ہو؟"

"بالکل خیریت سے ہوں۔ ابھی ایک گھنٹہ پہلے تو ہم نے فون پر بات کی تھی۔"

"ہاں' مگر اب حالات کچھ اور ہیں۔ دیکھو ساحرہ! میں نے مستقبل کے آئینے میں تمہیں دیکھا ہے۔"

"اوہ گاڈ! اتنے عرصے کے بعد پھر تمہیں مستقبل کا آئینہ نظر آگیا۔"

"ساحرہ! میری باتوں کو جھوٹ نہ سمجھنا۔ سنو! پہلے ریسیور ایک طرف رکھ کر اپنے کمرے کے دروازے اور کھڑکیوں کو اچھی طرح اندر سے بند کرلو تاکہ کوئی نہ آسکے۔"

"بھئی' یہاں کون آسکتا ہے۔ باہر چوکیدار ہے' کوٹھی میں ملازم ہیں۔ پھر میرے پاس بیڈ روم میں ریوالور رہتا ہے۔ تمہیں آخر کس بات کا اندیشہ ہے؟"

وہ بولا۔ "میں صحیح طور پر کہہ تو نہیں سکتا۔ آج رات کو یا کسی بھی رات کو بارہ بجے کوئی تمہاری خواب گاہ میں داخل ہوگا اور وہ تمہیں قتل کرے گا۔ تمہیں محتاط رہنا چاہئے۔ تم اپنے انکل صمد بخاری کو اپنے پاس بلالو یا ان سے درخواست کرو کہ وہ تمہارے لئے حفاظتی انتظامات کریں۔"

"پلیز کاشف! اگر یہ بات انکل کو معلوم ہوئی تو وہ تمہاری ذہنی حالت پر شبہ کریں گے۔"

"دیکھو ساحرہ! میں نے معلوم کیا ہے۔ تمہارے پاس پہنچنے کے لئے کل شام سے پہلے کوئی فلائٹ نہیں ہے۔ میں یہاں مجبور ہوں۔ میں چاہتا ہوں کسی طرح میرے آنے تک تم محفوظ رہو۔ اس کے بعد میں ہر رات تمہاری حفاظت کے لئے تمہارے پاس موجود

رہا کروں گا۔"

"تم بہت زیادہ پریشان ہو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارے آنے تک اپنا خیال رکھوں گی۔ ابھی دروازوں اور کھڑکیوں کو اندر سے بند کررہی ہوں۔ تم اطمینان رکھو۔"

"مجھے اطمینان نہیں ہوگا۔ تم پہلے ریسیور کو رکھو اور دروازوں اور کھڑکیوں کو بند کرو۔"

"اچھا ابھی تمہارے حکم کی تعمیل کرتی ہوں۔"

اس کے بعد خاموشی چھاگئی۔ وہ یقیناً دروازے اور کھڑکیوں کو بند کرنے کے لئے گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پھر اس کی آواز سنائی دی۔ "لو' میں نے اپنے آپ کو اپنی خواب گاہ میں قید کرلیا ہے۔ جب تک تم نہیں کہو گے میں دروازہ کھول کر باہر نہیں جاؤں گی۔"

"اور جب تک میں نہیں کہوں گا' تم دروازہ کھول کر کسی ملازم کو بھی اندر نہیں آنے دو گی۔"

"اچھا بابا! جو کہہ رہے ہو وہی کروں گی اور کچھ؟"

"ہاں' میں نے آج رات کے لئے تین کالیں بک کرائی ہیں۔ ایک تو بارہ بجے سے دس منٹ پہلے تم سے رابطہ قائم کروں گا۔ پھر دو بجے رات کو' پھر چھ بجے صبح کو۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "کاشف! تم مجھے کس قدر چاہتے ہو۔ مجھ سے رابطہ قائم کرتے رہنے' میری آواز سنتے رہنے اور مجھے اپنے قریب سے قریب تر محسوس کرنے کے لئے تم نہ تو مجھے سونے دو گے نہ خود سوؤ گے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے میں نہیں جانتی کہ تم نے مستقبل کے آئینے میں کیا دیکھا ہے اور جو کچھ دیکھا ہے وہ پورا ہوگا یا نہیں۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر خوشی اور فخر کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ میرا سرتاج مجھ سے سینکڑوں میل دور جاکر بھی میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"تم اپنے ریوالور کو اچھی طرح چیک کرو۔ پوری طرح لوڈ ہے یا نہیں؟"

ذرا دیر کی خاموشی کے بعد ساحرہ نے کہا۔ "میں نے چیک کرلیا ہے' یہ لوڈ ہے۔"

"ساحرہ! جب میں بچہ تھا تب ہماری وہ کوٹھی تعمیر کی گئی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ ہمارے اس بیڈ روم کے نیچے کوئی تہہ خانہ ہے یا نہیں۔ تم ابھی وہاں کا قالین الٹ کر معلوم کرسکتی ہو۔ کسی کمرے کے نیچے کسی تہہ خانے کا سراغ کس طرح لگایا جاتا ہے' یہ

میں تمہیں بتاتا ہوں۔"

ساحرہ نے کہا۔ "تم کیا بتاؤ گے۔ ہماری خواب گاہ پہلی منزل پر ہے اور خواب گاہ کے نیچے گراؤنڈ فلور کا بڑا سا ڈرائنگ روم ہے۔ کیا تم پیش گوئی کرنے کی دھن میں اپنی کوٹھی کا نقشہ بھول گئے ہو۔"

کاشف نے ایک ہاتھ سے اپنے سر کو کھجاتے ہوئے کہا۔ "اوہ' یہ تو میں بھول ہی گیا تھا لیکن میں نے اس خواب گاہ کے نیچے تہہ خانہ دیکھا ہے۔"

"یہی تو میں کہتی ہوں۔ اگر یہ باتیں تم دوسروں کے سامنے کہو گے تو وہ پھر تمہاری ذہنی حالت پر شبہ کرنے لگیں گے۔ پلیز کاشف! کوئی ایسی بات نہ کرو جس سے دوسروں کو تمہارے پاگل پن کا ثبوت مل سکے۔"

"کیا تم سمجھتی ہو' میں اس وقت نارمل نہیں ہوں؟"

"تم بالکل نارمل ہو۔ میں ایک شریکِ حیات کی حیثیت سے تمہارے ایک ایک لفظ پر یقین کرتی ہوں' میرے سوا کسی اور کے سامنے پیش گوئی نہ کرو۔ میرے متعلق تمہیں مستقبل کے آئینے میں جو کچھ بھی دکھائی دیتا ہے' تم اسے میرے اور اپنے درمیان رکھو۔ اگر دوسروں سے کہو گے تو بات بگڑ جائے گی۔ میں نہیں چاہتی کہ لوگ تمہاری ذہنی حالت پر شبہ کریں۔"

"اچھی بات ہے' تم وعدہ کرو' پوری طرح محتاط رہو گی' آج رات جاگتی رہو گی' میرے فون کا انتظار کرتی رہو گی اور کسی کو کمرے میں نہیں آنے دو گی۔"

"میں تمہارے ہر حکم کی تعمیل کروں گی۔"

وہ بیس منٹ تک باتیں کرتے رہے پھر رابطہ ختم ہوگیا۔ کاشف کا سکون برباد ہوگیا تھا۔ وہ کمرے میں ٹہلتے ہوئے سوچنے لگا۔ بے شک ہماری خواب گاہ کے نیچے کوئی تہہ خانہ ہو نہیں سکتا کیونکہ نیچے گراؤنڈ فلور پر بڑا سا ڈرائنگ روم ہے۔ پھر میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے کمرے کے نیچے تہہ خانہ کیسے دیکھا؟

وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر یہ بات سمجھ میں آئی کہ اکثر مستقبل کے آئینے میں ایسے واقعات دیکھے ہیں جو واضح نہیں تھے بلکہ علامتی تھے۔ مثلاً اس نے اپنے والد کی موت سے پہلے یہ نہیں دیکھا تھا کہ وہ کس طرح حادثے کا شکار ہوں گے۔ اس نے صرف

اپنی والدہ کی چوڑیوں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ بیوہ ہونے والی ہیں یعنی اس کے والد مرنے والے ہیں۔

اسی طرح وہ ساحرہ کے سلسلے میں غور کرنے لگا تو بات سمجھ میں آنے لگی۔ خواب گاہ کے نیچے کوئی تہہ خانہ نہیں تھا۔ یہ تہہ خانہ ایک علامت کے طور پر تھا یعنی ساحرہ مرنے کے بعد قبر میں دفن کی جائے گی۔ قبر بھی ایک ایسا تہہ خانہ ہوتا ہے جہاں گھٹن ہوتی ہے' گرمی ہوتی ہے' تاریکی ہوتی ہے اور جہاں سے کوئی دوبارہ نکل کر دنیا میں واپس نہیں آتا۔

وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ "اوہ خدایا! کیا میری ساحرہ کے دن پورے ہوگئے ہیں؟ کیا میری زندگی میں صرف اتنی ہی محبت اور اس محبت کرنے والی کی رفاقت لکھی ہوئی تھی؟ اس کے بعد میں بالکل تنہا رہ جاؤں گا؟ میرے مالک! میرے معبود! اسے میری عمر دے دے۔ کوئی ایسا راستہ دکھا دے کہ اس کی موت ٹل جائے مجھے ایسی روشنی دکھا دے میرے معبود!"

زندگی کی روشنی ایک ہی بار ملتی ہے۔ اگر بار بار ملتی تو سب سے زیادہ التجا آمیز اور متاثر کن دعائیں ماؤں کی ہوتی ہیں۔ وہ اپنی تڑپا دینے والی دعاؤں سے بار بار اپنی اولاد کے لئے زندگی کی روشنی مانگ کر لے آتیں لیکن ایسا نہیں ہوتا۔

ماں کی دعاؤں کی بات یاد آئی تو اسے امی کی بد دعا یاد آئی۔ اس کی امی نے کہا تھا۔ "اللہ تعالیٰ تمہیں بھی آگہی کے عذاب میں مبتلا کرے۔"

وہ گھبرا کر اٹھ گیا۔ پھر ٹہلنے لگا۔ آج اسے پتا چلا کہ آگہی کا عذاب کیا ہوتا ہے؟ دوسروں کے متعلق پیش گوئی کر دینا انہیں مستقبل کے حالات بتا دینا نہایت آسان بھی ہوتا ہے اور دلچسپ بھی لیکن یہی دلچسپی اپنے لئے جان کا عذاب بن جاتی ہے۔ زندگی میں پہلی بار اس نے تڑپ کر سوچا۔ کاش مجھے مستقبل کے حالات معلوم نہیں ہوتے' ساحرہ کو چپ چاپ اپنے وقت پر موت آتی' وہ مرجاتی' وہ اس کا ماتم کرتا' صدمہ سہتا' پھر رفتہ رفتہ دنیا کے کاروبار میں مصروف ہوجاتا لیکن یہ وقت سے پہلے آگہی.........."

سامنے محبوب زندہ ہو اور ہر لمحہ مرتا ہوا نظر آرہا ہو تو محبوب سے محبت کرنے والا کس کرب میں مبتلا ہوتا ہے' یہ صرف کاشف ہی سمجھ رہا تھا یا پھر اس سے پہلے اس کی امی سمجھتی رہی ہوں گی۔ اسی لئے تو انہوں نے جلے دل سے بد دعا دی تھی۔

بارہ بجنے سے دس منٹ پہلے ساحرہ سے پھر رابطہ قائم ہوگیا۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگا۔ ساحرہ نے کہا۔ "میں نے تمہاری گھڑی سے اپنی گھڑی ملالی ہے۔ اس وقت بارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی ہیں۔"

وہ پانچ منٹ بھی باتوں میں گزر گئے۔ ٹھیک بارہ بجے دور کہیں کوئی گھڑیال ٹن ٹن کی آواز کے ساتھ آدھی رات کا اعلان کر رہا ہوگا لیکن موت اپنی آمد کی ایک ذرا آہٹ بھی نہیں سناتی۔ کاشف کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ ریسیور کان سے لگائے ساحرہ کو باتوں میں مصروف رکھنا چاہتا تھا تاکہ اس کی زندگی کا یقین ہوتا رہے۔ ساحرہ کو کسی بات کا اندیشہ نہیں تھا۔ وہ صرف اپنے شوہر کی خوشی کے لئے اس کی ہاں میں ہاں ملاتی رہتی تھی۔ بارہ بج کر پانچ منٹ پر اس نے کہا۔ "دیکھو کاشف! وقت گزر گیا۔ تمہاری پیش گوئی درست ثابت نہیں ہوئی۔"

اس نے کہا۔ "ہوسکتا ہے ہماری گھڑی دس منٹ آگے ہو۔"

وہ دس منٹ بھی گزر گئے۔ کاشف نے کہا۔ "اب میری سمجھ میں یہ آرہا ہے کہ تمہارے کمرے میں کوئی قاتل نہیں آئے گا۔ بلکہ یہ ایک علامت ہے' جو تمہارے کمرے میں سیاہ نقاب پہنے آیا تھا' وہ قاتل نہیں بلکہ موت تھی اور موت بند کمرے میں بھی آجاتی ہے۔"

"اب تم مجھے ڈرانا چاہتے ہو۔"

"حوصلہ رکھو۔ دراصل میں کسی قاتل کے متعلق سوچ رہا تھا۔ لہٰذا احتیاطی تدابیر کے لئے تمہیں پیش گوئی سنائی تھی۔ اب وہ بات نہیں ہے تم آرام کرو۔ موت کا وقت ٹل گیا ہے۔ میں دو بجے پھر تم سے رابطہ قائم کروں گا۔"

دو بجے بھی رابطہ قائم ہوا۔ پھر صبح چھ بجے بھی رابطہ قائم ہوا۔ وہ زندہ تھی۔ اس رات بارہ بجے موت کا وقت ٹل گیا تھا۔

دوسری رات وہ اپنی ساحرہ کے پاس پہنچ گیا اور اپنے وعدے کے مطابق اس نے اسے تنہا نہیں چھوڑا۔ اس رات بھی وہ بارہ بجے تک انتظار کرتا رہا۔ اس کے ساتھ جاگتا رہا۔ اسے جگاتا رہا۔ بظاہر ہنستا بولتا رہا لیکن اندر ہی اندر اندیشوں میں گھرا رہا۔

موت یقیناً فکر اور اندیشوں سے بہتر ہے کیونکہ موت آتی ہے تو ایک بار مار کر چلی

جاتی ہے۔ فکر اور اندیشے آہستہ آہستہ مارتے رہتے ہیں۔ کاشف کی حالت بدلنے لگی۔ وہ راتوں کو پوری نیند نہیں سوتا تھا۔ بارہ بجے تک ضرور جاگتا تھا۔ اس کے بعد ساحرہ اسے محبت سے تھپک تھپک کر سلادیتی تھی' تب بھی وہ چونک چونک کر اٹھ جاتا تھا۔ دیکھتا تھا' وہ گہری نیند سو رہی ہے اور زندہ ہے تو پھر وہ سونے کی کوشش کرتا تھا لیکن ہوتا یہی تھا کہ ساری رات سکون سے نیند نہیں آتی تھی۔ صبح اٹھ کر کبھی شیو بناتا تھا۔ کبھی یونہی چلا جاتا تھا۔ ساحرہ اسے سلیقے کا لباس پہننے پر مجبور کرتی تھی لیکن کبھی اس کی قمیض کا کوئی بٹن کھلا رہتا اور کبھی آدھی قمیض پتلون سے باہر نکلی رہتی۔ کبھی نکٹائی کی گرہ غلط نظر آتی' بال بکھرے ہوتے۔ چہرے سے وحشت برستی رہتی۔ ایک دن صمد بخاری نے پوچھا۔ "یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

"کچھ نہیں' بس یونہی ذرا کاروباری پریشانی ہے؟"

"مجھ سے جھوٹ مت بولو۔ ساحرہ نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم اپنی بچگانہ پیش گوئی سے باز نہیں آؤ گے؟"

"انکل! میں سچ کہتا ہوں۔ میں نے جو دیکھا ہے' وہ پورا ہوگا میری ساحرہ مجھ سے بچھڑ جائے گی۔"

"یہ پاگل پن ہے۔ اگر تم اپنی بات پر بضد رہے تو ساحرہ زندہ ہی رہے گی مگر تم اس دنیا سے اٹھ جاؤ گے۔"

"آپ میرا ساتھ دینے کا وعدہ کریں تو میں ہنسی خوشی زندہ رہنے کی کوشش کروں گا۔"

"تم کس طرح کا تعاون چاہتے ہو؟"

"یہی کہ خدانخواستہ ساحرہ کی موت واقع ہو تو پہلے ڈاکٹروں سے اس کی موت کی تصدیق کرائی جائے۔"

"یقیناً کوئی بھی مرتا ہے تو ڈیتھ سرٹیفکیٹ حاصل کیا جاتا ہے۔"

"ایک بات اور' ساحرہ کی موت واقع ہو اور اسے قبر میں دفن کردیا جائے تو اس کے بعد ہم قبر کھود کر اسے دیکھیں گے۔"

صمد بخاری نے ایسے چونک کر اسے دیکھا جیسے کسی پاگل کو دیکھ رہا ہو۔ پھر اس نے

سخت لہجے میں پوچھا۔ "کیا تم اپنے ہوش میں ہو' جب ہم اپنی آنکھوں کے سامنے اسے دفن کردیں گے تو پھر قبر کھود کر دوبارہ دیکھنے کا کیا مطلب ہوا؟"

"انکل! آپ نہیں سمجھتے ایسا ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد سانس واپس آجاتی ہے۔ ہوسکتا ہے ہم اسے دفنا کر قبرستان سے واپس جائیں اور وہ قبر کے اندر زندہ ہوجائے۔ باہر نکلنے کی کوشش کرے۔"

صمد بخاری نے غصے سے کہا۔ "تم پاگل ہوگئے ہو۔ اگر یہ بات ساحرہ نے سن لی تو وہ دہشت زدہ رہے گی۔ اس کے دماغ میں یہ بات سما جائے گی کہ مرنے کے بعد انسان زندہ ہوسکتا ہے۔ اس کی سانس واپس آسکتی ہے اور اگر قبر کے اندر اس کی سانس آئے گی تو اس کی کیا حالت ہوگی؟ کیا تم اس کی موت سے پہلے اسے مار ڈالنا چاہتے ہو؟"

"میں نہ تو اسے دہشت زدہ کرنا چاہتا ہوں' نہ وقت سے پہلے مارنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی پیش گوئی سناتے وقت یہ نہیں بتایا ہے کہ وہ مرنے کے بعد زندہ ہوسکتی ہے۔"

"یہ تم نے دانش مندی کا ثبوت دیا ہے اور آئندہ کسی بھی جذباتی لمحے میں یہ بات منہ سے نہ نکالنا۔"

"میں آپ کی ہر بات مانتا رہوں گا۔ آپ بھی میری یہ ایک بات مان لیں۔"

"ہرگز نہیں۔"

"کیوں نہیں؟ ایسا ہوتا ہے۔ کسی کو دفنانے کے بعد کسی وجہ سے قبر دوبارہ کھودی جاتی ہے۔"

"ہاں' اس کی ٹھوس وجوہات ہوتی ہیں۔ کسی محافظ قانون سے اجازت لی جاتی ہے۔"

"ہم بھی اجازت لیں گے۔"

"تمہیں اجازت نہیں ملے گی۔ میں نے سنا ہے' میاں بیوی کا رشتہ صرف زندگی کی سانس چلنے تک ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد بیوی نامحرم ہوجاتی ہے۔ شوہر اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔ تم قبر کھود کر اسے کیسے دیکھو گے؟"

"آپ نے یہ سب کچھ اپنے بزرگوں سے سنا ہے لیکن ہم کسی عالم دین سے رجوع کریں گے۔ اس مسئلے کے متعلق دریافت کریں گے ہوسکتا ہے' مجھے اپنی بیوی کا چہرہ

دیکھنے کی اجازت مل جائے۔"

"اجازت ملے گی تب بھی میں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ آخر دوبارہ قبر کھودنے کی کوئی ٹھوس وجہ ہونی چاہئے۔"

"میں نے دیکھا ہے' اپنے تصور میں دیکھا ہے۔ مستقبل کے آئینے میں دیکھا ہے۔ وہ تہہ خانے کے اوپر پڑی ہوئی وزنی چٹان کو ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی' چیخ رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ مردہ نہیں ہے۔ اس کی سانس واپس آگئی ہے۔ وہ زندہ رہنا چاہتی ہے' اسے وہاں سے نکالا جائے۔"

صمد بخاری نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام کر کہا۔ "کاشف! اگر تم میری بھتیجی کے شوہر نہ ہوتے تو میں اسی وقت تمہیں پاگل خانے بھجوا دیتا۔ آئندہ مجھ سے اس قسم کی احمقانہ گفتگو نہ کرنا۔"

"آپ مجھے احمق یا پاگل کیوں سمجھتے ہیں؟"

"تم نے جو بھی پیش گوئی کی ہے' وہ محض تمہارا اپنا وہم تھا۔ ورنہ تم جب بھی اپنے منہ سے کوئی بات نکالتے تھے تو تمہارا وہ شاطر چچا اس پر عمل کرتا تھا اور بالآخر تمہاری پیش گوئی کو درست ثابت کر دیتا تھا۔ کیا تم نے اس کا وہ بیان ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے نہیں سنا تھا؟" کاشف نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ صمد بخاری نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "نہیں۔ اب میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے معلوم ہے کہ پاگلوں کے ساتھ بحث کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا جانے لگا۔ کاشف اس کے جاتے ہوئے قدموں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر ایک دم سے لرز گیا۔ اسے ایک اور بات یاد آئی۔ جو لوگ اس کے تصور میں ساحرہ کو تہہ خانے میں چھوڑ گئے تھے' ان کے جاتے ہوئے قدموں کو اس نے گنا تھا۔ وہ چالیس قدم دور چلے گئے تھے۔ تب ساحرہ کی چیخ سنائی دی تھی۔ یہ بات بھی علامتی ہے۔ کہتے ہیں کہ لوگ جب کسی مردے کو دفنانے کے بعد چالیس قدم دور چلے جاتے ہیں تو فرشتے اس مردے سے سوال کرنے کے لئے قبر میں آتے ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مردہ قبر میں زندہ ہوتا ہے تب ہی فرشتے سوالات کرنے آتے ہیں۔ اس کی پیش گوئی میں ان چالیس قدموں کی بھی بڑی اہمیت تھی۔

لیکن کون اس کی بات کو درست سمجھ سکتا تھا۔ وہ ایسی باتیں کر رہا تھا جو زندہ انسانوں میں قابلِ قبول نہیں ہوتیں۔ ساحرہ اس کی باتوں سے کھل کر انکار نہیں کرتی تھی لیکن دبی زبان سے کہتی رہتی تھی۔ "دیکھئے' آپ کی پیش گوئی کو تین ہفتے گزر چکے ہیں اور میں آپ کی محبت کے طفیل اب تک زندہ ہوں۔ اللہ نے چاہا تو میں زندہ رہوں گی۔ آپ نے اپنی تسلی کے لئے میرا میڈیکل چیک اپ بھی کرایا ہے۔ مجھے کوئی ایسی بیماری نہیں ہے جو تشویشناک ہو۔"

وہ کوئی جواب نہ دے سکا لیکن جواب نہ دینے کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس نے دنیا والوں کی باتیں تسلیم کرلی ہیں وہ بچپن سے ہی مستقبل کو آئینے میں اتنے یقین سے دیکھتا تھا جتنا کہ لوگ عام طور سے آئینے کے سامنے اپنے وجود کو یقین سے دیکھتے ہیں۔

☆======☆======☆

ایک دن ساحرہ کو معلوم ہوا کہ کاشف کو کاروبار کے سلسلے میں کوئٹہ جانا چاہئے لیکن وہ نہیں جارہا ہے۔ اس نے پوچھا۔ "کیوں نہیں جارہے ہو؟"

"بس یونہی' کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے ہماری آمدنی اتنی ہے کہ کسی کاروباری معاملے میں میرا خود جانا ضروری نہیں ہے۔"

"اچھی خاصی آمدنی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کاروبار کو منیجر اور جنرل منیجر کے بھروسے پر چھوڑ دیا جائے۔ تمہیں ضرور جانا چاہئے۔"

"میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

ساحرہ نے پریشان ہو کر کہا۔ "تم دن بدن بچے بنتے جارہے ہو۔ اچھا' اگر میں تمہارے ساتھ کوئٹہ چلوں تو؟"

وہ راضی ہوگیا۔ دوسرے ہی دن وہ کوئٹہ پہنچ گئے۔ وہاں ان کی مل کے کپڑوں کا ایک تھوک بیوپاری تھا جس نے انہیں ہوٹل میں ٹھہرنے نہیں دیا۔ ضد کرکے اپنے ہاں لے آیا۔ اس کی صرف ایک بیوی اور ایک بچہ تھا۔ رشتے داروں کی بھیڑ نہیں تھی۔ اس لئے وہ وہاں دو دن قیام کرنے پر راضی ہوگئے۔

میزبان بزنس مین نے ان کے لئے ایک اچھا سا کمرہ مخصوص کردیا تھا۔ کاشف نے وہاں بھی ساحرہ کو تنہا نہیں چھوڑا۔ حتیٰ کہ رات کو بارہ بجے تک جاگتا رہا۔ اپنے معمول کے مطابق آدھی رات کو سونے کے باوجود کبھی کبھی وہ بیدار ہوجاتا تھا۔ [illegible] ساحرہ کو دیکھتا تھا پھر مطمئن ہوکر سوجاتا تھا۔

وہ بے چارہ بھول گیا تھا کہ چوروں اور بدمعاشوں کے خلاف پہرے بٹھائے جاسکتے ہیں' شریفوں کو نو ایڈمیشن کا شریفانہ بورڈ لگا کر آنے سے روکا جاسکتا ہے لیکن اپنے عزیز ترین رشتے کو گلے لگا کر بھی موت کو گلے لگنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

دوسری رات بارہ بجنے میں صرف چند سیکنڈ رہ گئے تھے کہ اچانک زلزلے کے جھٹکے محسوس ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی دور دور تک لوگوں کے چیخنے چلّانے کی آوازیں سنائی دیں اچھی خاصی بھگدڑ مچ گئی۔ وہ بھی ساحرہ کو لے کر اس کمرے سے نکلنا چاہتا تھا کہ دوسری بار زلزلے کا زبردست جھٹکا آیا۔ ساحرہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کی چیخ سنائی دی لیکن وہ اسے دیکھ نہ سکا۔ چھت کا کچھ حصہ ان کے درمیان گر پڑا تھا۔ پھر یہ کہ زلزلے کے آغاز سے ہی تاریکی چھا گئی تھی۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "ساحرہ! گھبراؤ نہیں' میں آرہا ہوں۔ ہمت سے کام لو۔"

وہ آگے بڑھا مگر ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ اس کے سامنے جانے کن چیزوں کا ڈھیر آن پڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس پر کوئی بھاری بھرکم سی چیز آکر گری۔ آنکھوں کے سامنے پہلے ہی اندھیرا تھا اور اندھیرا چھا گیا۔ پھر اسے ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے؟ زندہ بھی ہے یا مرچکا ہے؟

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک اجنبی ماحول میں پایا۔ اس کے سر میں شدید تکلیف تھی۔ وہ زیادہ دیر تک آنکھیں نہ کھول سکا۔ پھر آنکھیں بند کرکے اس ماحول کو محسوس کرنے لگا۔ تب پتا چلا' وہ کسی اسپتال میں ہے۔ اسے بڑی کمزوری محسوس ہورہی تھی۔ وہ دوبارہ آنکھیں نہ کھول سکا۔ پھر گہری نیند میں ڈوب گیا۔ دوسری بار آنکھ کھلی تو ڈاکٹر اس کی نبض ٹٹول رہا تھا۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ ایک نرس اسے انجکشن لگا رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ کو تھپک کر کہا۔ "یو وِل بی آل رائٹ ان نو ٹائم۔"

ایک وارڈ بوائے نے اسے ذرا سہارا دے کر اٹھایا۔ اسے دودھ پلایا گیا' پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اب تک دوبارہ آنکھیں کھولنے کے باوجود وہ ساحرہ کو یاد نہ کرسکا کیونکہ خود اپنے آپ میں نہیں تھا' اس پر ایسی مردنی چھائی ہوئی تھی جیسے برائے نام زندہ ہو۔ آنکھیں تو کھول رہا ہو لیکن دماغ کام نہ کررہا ہو۔

وقت گزرنے لگا۔ وہ غفلت کے عالم میں پڑا رہا۔ جب تیسری بار آنکھ کھلی تو وہ قدرے ہوش و حواس میں تھا۔ اسے کچھ کھلایا گیا۔ کھانے کے بعد نرس دوا لے کر آئی۔ نرس کا چہرہ دیکھتے ہی ایک دم سے ساحرہ کا مسکراتا ہوا چہرہ نگاہوں کے سامنے آیا۔ وہ ہڑبڑا

کر اٹھتا ہوا' اپنے اوپر کی چادر کو ایک طرف پھینکتا ہوا اچھل کر فرش پر کھڑا ہوگیا۔ پھر چیخ کر بولا۔ "ساحرہ! تم کہاں ہو؟ ساحرہ!"

نرس گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ وارڈ بوائے نے آکر اسے پکڑ لیا۔ پھر کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں' آپ کے ایک عزیز آپ کو تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچ گئے ہیں۔"

اس نے وارڈ بوائے کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا........ "مجھے ان کے پاس لے چلو مجھے بتاؤ' ساحرہ کہاں ہے؟"

وارڈ بوائے نے اس کی رہنمائی کی۔ اسپتال کے انکوائری کاؤنٹر کے پاس اسے پہنچا دیا۔ وہاں سے صمد بخاری کو اطلاع دی گئی۔ وہ اسی اسپتال کے ایک ویٹنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا' دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا۔ کاشف نے اسے دیکھتے ہی اس کے بازو کو تھام کر پوچھا۔ "ساحرہ کہاں ہے؟"

صمد بخاری نے اس کے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "ایزی بوائے ایزی تمہیں بستر سے اس طرح اٹھ کر نہیں آنا چاہئے تھا۔"

"میں پوچھ رہا ہوں ساحرہ کہاں ہے؟"

اس نے ایک گہری سانس لی۔ پھر اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر کہا۔ "کاشف! زندگی میں بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اپنے دل کو مضبوط کرو اور حوصلے سے سنو! وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی؟"

کاشف نے یکبارگی چیخ کر کہا۔ "نہیں' وہ نہیں مرسکتی مجھے اس کے پاس لے چلو۔ اس کی لاش کہاں ہے؟ میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ اس کی سانس عارضی طور پر رک گئی ہوگی۔ وہ پھر زندہ ہوگی۔ خدا کے لئے مجھے اس کے پاس لے چلو۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "ہم نے ساحرہ کو دفن کردیا ہے۔"

وہ چیخ کر بولا۔ "یہ جھوٹ ہے۔ آپ ایسا نہیں کرسکتے ہیں۔ میں اس کا شوہر ہوں۔ میری اجازت کے بغیر اسے دفن نہیں کیا جاسکتا۔"

"ہوش میں آؤ' تم نہیں جانتے کہ کتنے عرصے تک یہاں اسپتال میں پڑے رہے ہو۔ اس کا انتقال ہوئے پچاس گھنٹے گزر چکے ہیں۔ میں نے اسے کم از کم چھتیس گھنٹے تک تمہارے انتظار میں رکھا مگر سرد خانے میں وی آئی پی لاشیں آرہی تھیں۔ جب تک ان

لاشوں کے عزیز واقارب نہ آتے اس وقت تک سرد خانے میں ساحرہ کے لئے گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔ میں مجبور تھا۔ مجھے مجبور کیا جارہا تھا کہ آفت زدہ علاقے میں لاشوں کا تعفن برداشت نہیں کیا جاسکتا' تب میں نے مجبور ہوکر اسے دفن کرادیا۔"

"آپ اس کی لاش کراچی لے جاسکتے تھے۔ وہاں کے کسی سرد خانے میں رکھوا سکتے تھے۔"

"وہ مرچکی تھی اور تم زندہ ہو۔ میں تمہارے لئے تشویش میں مبتلا تھا۔ تمہیں چھوڑ کر اس کی لاش کراچی کیسے لے جاسکتا تھا۔ ڈاکٹروں کی طرف سے بھی تصدیق ہوگئی تھی کہ وہ مرچکی ہے۔ پھر اس کی آخری رسومات ادا کرنے میں' میں دیر کیوں کرتا؟"

"میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ آپ مجھے فوراً اس کی قبر پر لے چلیں۔"

"ابھی لے چلتا ہوں لیکن ڈاکٹروں سے پوچھ تو لو کہ تم وہاں تک جانے کے قابل ہو یا نہیں؟"

"میں وہاں تک جاتے جاتے مرجاؤں گا لیکن ضرور جاؤں گا۔ مجھے کسی ڈاکٹر سے نہیں پوچھنا ہے۔ آپ نہیں لے جائیں گے تو میں قبرستان میں جاکر اسے پکارتا رہوں گا اور بھٹکتا رہوں گا۔"

صمد بخاری نے اس کی دیوانگی کو تشویش بھری نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

وہ تھوڑی دیر بعد صمد بخاری کے ساتھ ایک جیپ کار میں بیٹھا قبرستان کی طرف جارہا تھا اور دھیرے دھیرے بڑبڑا رہا تھا۔ "میں جانتا ہوں' میری بات پر کوئی یقین نہیں کرتا۔ آپ بھی نہیں کرتے تھے۔ اسی لئے آپ نے میرا انتظار کئے بغیر اسے قبر میں اتار دیا۔ میں یہ کرب کس طرح برداشت کررہا ہوں' یہ میں جانتا ہوں۔ مجھے جلدی لے چلئے۔"

"یہاں کے بہت سے راستوں میں رکاوٹیں پیدا ہوگئی ہیں درخت گر گئے ہیں' عمارتیں زمین بوس ہوگئی ہیں۔ میں دوسرے راستے سے تمہیں وہاں تک لے جارہا ہوں۔"

"کیا آپ زلزلے کی خبر پڑھ کر یہاں آئے ہیں؟"

"نہیں۔ زلزلے کے چار گھنٹے بعد ہی میرے ایک شناسا پولیس آفیسر نے فون کے ذریعے اطلاع دی تھی کہ یہاں میری ایک عزیزہ ساحرہ بیگم کا انتقال ہوگیا ہے۔ دراصل تم لوگوں کے سامان میں شناختی کارڈ موجود تھے۔ پھر ڈائری میں مختلف پتے نوٹ کئے ہوئے تھے۔ میرا پتا پڑھنے کے بعد ہی اس پولیس آفیسر نے مجھے اطلاع دی تھی۔"

"کیا ساحرہ بری طرح زخمی ہوئی تھی؟"

"نہیں۔ اسے ایک ذرا چوٹ نہیں آئی تھی۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق خوف ودہشت سے اس کا دم نکل گیا ہے۔ حرکت قلب بند ہوگئی تھی۔"

کاشف نے اپنی ران پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ مرنے کے باوجود زندہ ہوگی۔ اسے چوٹ نہیں آئی تھی' وہ زخمی نہیں ہوئی تھی۔ صرف دہشت کے مارے سانس رک گئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہئے کہ دہشت کے مارے سانس لینا بھول گئی تھی۔ ایسا ہوتا ہے' کبھی کبھی اوپر کی سانس اوپر رہ جاتی ہے' دیر تک سانس واپس نہیں آتی۔ پھر سینے کو دبایا جائے' دوسرے طبی ذرائع اختیار کئے جائیں تو سانس واپس آجاتی ہے۔"

"پلیز کاشف! ڈاکٹروں نے سب کچھ دیکھا تھا۔ اس کی سانس واپس نہیں آئی تھی۔ انہوں نے اس کی موت کی تصدیق کردی تھی۔"

آخر وہ ساحرہ کی قبر کے قریب پہنچ گئے۔ صمد بخاری نے نشانی کے طور پر قبر کے سرہانے ایک بے ڈھنگے سے پتھر پر چونے سے ساحرہ کا نام لکھ دیا تھا۔ اس کی قبر پر پہنچتے ہی کاشف گھٹنے ٹیک کر قبر سے لپٹ گیا۔ کہنے لگا۔ "اسے کھود کر میری ساحرہ کو دکھاؤ۔ وہ زندہ ہے۔ انکل! میں قسم کھا کر کہتا ہوں وہ زندہ ہے۔"

"کاشف! اب ہوش میں آؤ' رونے' چیخنے' چلّانے اور احمقانہ باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ اگر تم سچ مچ اس سے محبت کرتے رہے ہو تو اس کے لئے دعا مانگو۔ فاتحہ پڑھو۔"

وہ چیخ کر اٹھ گیا۔ دونوں مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ "فاتحہ مرنے والوں کے لئے پڑھی جاتی ہے' وہ زندہ ہے۔ میں اسے کھود کر باہر نکالوں گا۔"

"میں تمہیں پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے نہیں دوں گا۔ چپ چاپ فاتحہ پڑھو اور

میرے ساتھ چلو۔"

اچانک اس نے پلٹ کر جھکتے ہوئے صمد بخاری کے پیٹ میں سر سے ایک زور کی ٹکر ماری۔ وہ اس کے لئے تیار نہیں تھا پیٹ پکڑ کر کراہنے لگا۔ جیسے ہی وہ جھکا' کاشف نے قریب پڑے ہوئے ایک بڑے پتھر کو اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ اس کے بعد وہ اٹھ نہ سکا۔ زمین پر سر پکڑ کر ایسے گرا کہ اس کے منہ سے صرف کراہیں نکلتی رہیں۔ یعنی کاشف کا حملہ اتنا شدید نہیں تھا کہ وہ پتھر کی ضرب سے مرجاتا۔

وہ دوڑتا ہوا گورکن کی جھگی میں پہنچا۔ پھر ہانپتے ہوئے بولا۔ "مجھے ایک کدال اور بیلچہ دو۔ تمہارا بڑا احسان ہوگا۔ ایک قبر میں زندہ عورت کو دفن کردیا گیا ہے۔ اسے فوراً نکالنا ہے۔"

گورکن نے اسے حیرانی اور پریشانی سے دیکھا۔ پھر کہا۔ "بابا معاف کرو' جب تک پولیس والے نہیں آتے اس وقت تک ہم خود نہ تو کسی قبر کو کھودتے ہیں۔ نہ کسی کو کھودنے دیتے ہیں۔"

اس نے پریشان ہو کر دیکھا۔ گورکن بہت مضبوط اور ہٹا کٹا تھا۔ اس کے پاس ایک اور آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ دونوں مل کر قبر کھودتے ہوں گے۔ کاشف نے چند لمحوں تک کچھ سوچا۔ پھر دوڑتا ہوا واپس صمد بخاری کے پاس آیا۔ اس کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ ایک جیب سے سات سو اور دوسری جیب سے پانچ سو برآمد ہوئے وہ پھر دوڑتا ہوا گورکن کے کمرے میں آیا۔ اس نے سو' سو کے نوٹ دکھاتے ہوئے کہا۔ "میں یہ تم دونوں کو دے دوں گا۔ بس کدال اور بیلچہ دے دو اور انجان بنے رہو۔ پولیس والے پوچھیں تو میرے متعلق لاعلمی ظاہر کرنا۔"

اتنے سارے نوٹ دیکھ کر انہوں نے فوراً ہی اسے کدال اور بیلچہ دے دیا۔ لالٹین وغیرہ کی ضرورت نہیں تھی۔ باہر پورا چاند نکلا ہوا تھا۔ چاندنی اس طرح پھیلی ہوئی تھی کہ دور تک ہر چیز واضح طور پر نظر آرہی تھی۔

وہ قبر کے پاس پہنچتے ہی کبھی کدال سے اور کبھی بیلچے سے مٹی ہٹانے لگا۔ صمد بخاری قریب ہی بے ہوش پڑا ہوا تھا۔

قبر کی اوپری مٹی دوسری طرف ڈھیر ہوتی جارہی تھی۔ پھر وہ قبر' زمین کی سطح کے

برابر ہوگئی۔ وہ بیلچے کو ایک طرف پھینک کر جلدی جلدی ہاتھوں سے مٹی کو ہٹانے لگا۔ اب سیمنٹ کے وہ سلیب نظر آرہے تھے جو قبر کے اوپر اس لئے جمائے جاتے ہیں کہ اوپر کی مٹی قبر کے اندر نہ جائے۔ اس نے دیوانہ وار آواز دی۔ "ساحرہ! ساحرہ! کیا تم میری آواز سن رہی ہو۔ میں تمہارے پاس آگیا ہوں۔"

جواب میں کراہنے کی آواز سنائی دی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا لیکن پتا چلا' وہ ساحرہ کی نہیں بلکہ صمد بخاری کی کراہیں تھیں۔ وہ ہوش میں آرہا تھا۔ کاشف نے فوراً ہی ایک سلیب کو اٹھایا۔ وہ بہت بھاری تھا مگر ایک آدمی اٹھا سکتا تھا۔ اس نے اسے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا قبر میں ایک خلاء سا پیدا ہوگیا۔

اگرچہ بھرپور چاندنی تھی لیکن وہ ذرا سے خلا میں پہنچ کر پوری طرح قبر کو روشن نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے دوسرے سلیب کو اٹھا کر ایک طرف رکھا۔ اب چاندنی اندر پہنچ رہی تھی۔ اس نے تیسرے سلیب کو اٹھا کر ایک طرف رکھا پھر چوتھے کو اٹھا کر رکھ رہا تھا کہ صمد بخاری کی ڈانٹ سنائی دی۔ "تم پاگل کے بچے ہو۔ اب میں تمہیں پاگل خانے پہنچا کر ہی رہوں گا۔"

وہ لڑکھڑاتا ہوا آیا لیکن کاشف کے قریب پہنچ کر ایک دم سے ٹھٹک گیا۔ قبر کے اندر چاندنی ایک ایک تفصیل کو واضح کررہی تھی۔ وہاں ساحرہ نظر آئی۔ لاش تو سر سے پاؤں تک کفن میں لپٹی ہوئی تھی لیکن ساحرہ کا منہ کھلا ہوا تھا۔ جیسے کفن منہ پر سے ہٹایا گیا ہو۔ پھر یہ کہ وہ سیدھی طرح لیٹی ہوئی نہیں تھی' قبر کے سرہانے والی دیوار سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے بالوں کو نوچ رہا تھا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیاں قبر کی سائڈ والی دیوار میں مٹی کے اندر تک دھنس گئی تھیں۔ چہرہ کرب و اذیت کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس کے پھیلے ہوئے دیدے آنے والوں پر جمے ہوئے تھے۔

کاشف کا سر چکرایا۔ وہ گرنا ہی چاہتا تھا کہ صمد بخاری نے اسے سنبھال لیا۔ دیر ہوچکی تھی' بہت دیر ہوچکی تھی جانے والوں کے چالیس قدم پورے ہونے سے پہلے اسے پہنچنا چاہئے تھا۔ آہ' بہت دیر ہوچکی تھی۔

☆======☆======☆

اندھیر نگری

جب دلوں میں نفرتیں پروان چڑھنے لگیں' دماغوں میں کچرا بھرنے لگے اور وفاداریاں نوٹوں کے عوض بکنے لگیں تو پھر ضمیر کا فیوز اڑ جاتا ہے' انسانی جسم کے اندر تاریکی چھا جاتی ہے۔ پھر انسان اندھیر نگری آباد کرلیتا ہے جہاں اندھے قانون کی حکمرانی ہوتی ہے۔ آگ و خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے' بے گناہوں کے لہو سے چراغاں کیا جاتا ہے' انسانیت کے حلق میں قطرہ قطرہ منشیات کا زہر ٹپکایا جاتا ہے۔

وہ روزانہ صبح پانچ بجے دو میل کی دوڑ لگاتا تھا۔ وہ دوڑ ایک میدان سے شروع کرتا تھا۔ پھر دوڑ لگاتا ہوا اسٹریٹ سیون میں داخل ہوتا تھا اور اس اسٹریٹ سے کسی دوسری اسٹریٹ میں مڑجاتا تھا۔ جہاں جہاں سے وہ گزرتا تھا' آس پاس کی بیشتر کوٹھیوں کی کھڑکیاں کھل جاتی تھیں۔ پردے سرک جاتے تھے اور حسین چہرے جھانکنے لگتے تھے وہ رازداری سے سرکنے والے پردے اور منتظر کھڑکیاں جانتی تھیں کہ ٹھیک پانچ اور سوا پانچ کے درمیان وہ یہاں سے گزرتا ہے۔ شیر کی طرح لانبے لانبے ڈگ بھرتا' زور زور سے ایک درندے کی طرح ہانپتا ہوا یوں لگتا تھا جیسے سیدھا ان کی طرف چلا آرہا ہو اور جب ایسا لگتا تھا تو پردے جذباتی حیا سے لرز لرز جاتے تھے۔ اس درندے کے ہانپنے کی آواز آتی تھی ہا' ہا اور کھڑکیوں سے جذبے انگڑائیاں لیتے تھے۔ہائے' ہائے۔

وہ پچھلے پانچ برس سے ٹھیک اپنے وقت پر دوڑتا ہوا ان راستوں سے گزرتا تھا۔ چاہے آندھی آئے' طوفان آئے' موسلا دھار بارش ہو' کڑکڑاتی سردی ہو یا جان جلا دینے والی گرمی ہو۔ وہ ہر حال میں وہاں سے گزرتا تھا۔ جان جلانے والی بات یہ تھی کہ وہ دائیں بائیں کبھی کسی کھڑکی کی طرف نہیں دیکھتا تھا۔ کتنی ہی لڑکیوں کو صبح خیزی کی عادت ہوگئی تھی وہ تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اپنی اپنی کوٹھیوں سے نکلتی تھیں اور سڑک پر ٹہلنے کے انداز میں اس کا استقبال کرتی تھیں۔ وہ دوڑتا ہوا آتا تھا لیکن اونٹ کی طرح سیدھا منہ اٹھائے چلا جاتا تھا۔ ان پانچ برسوں میں کچھ لڑکیوں نے مایوس ہو کر پٹری بدل دی۔ کچھ لڑکیاں بیاہ کر چلی گئیں اور ان پانچ برسوں میں کتنی ہی لڑکیاں پانچ پانچ بچوں کی مائیں بن گئیں لیکن اس دوڑنے والے کے فرشتوں کو بھی یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اس کے پیچھے کیا ہو رہا ہے۔

ایک روز اچانک ایک ایسی بات ہوئی جو پہلے پانچ برسوں میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔

تمام لڑکیوں نے دل تھام کر اسے دیکھا۔ وہ دوڑتے دوڑتے ایک کوٹھی کے سامنے اچانک رک گیا تھا بری طرح ہانپتے ہوئے اس کوٹھی کو دیکھ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا اس کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف ایسے جارہا تھا جیسے شیر دبے پاؤں اپنے شکار کی طرف جاتا ہے۔ لڑکیوں کے دل دھڑک رہے ہوں گے۔ سوچ رہی ہوں گی' پتا نہیں' آج کس خوش نصیب نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے۔ وہ جس طرف بڑھ رہا تھا' اس طرف کوٹھی کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ پردہ ذرا ہٹا ہوا تھا لیکن پردے کے پیچھے کوئی نظر نہیں آرہا تھا لیکن کسی کے نظر نہ آنے سے کیا ہوتا ہے ویسے یہ ماننے والی بات نہیں تھی کہ آج وہ ہاتھی جیسا ڈیل ڈول رکھنے والا' چیتے جیسا پھرتیلا اور پہاڑ جیسا قد آور جوان کچھ دیکھے سنے بغیر اس کوٹھی کی طرف جارہا ہو۔

اس کوٹھی کا مین گیٹ بہت اونچا تھا لیکن اس کی اونچائی اس پہاڑ کی گردن تک تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دوسری طرف جھانکتے ہوئے چوکیدار سے پوچھا۔ "اے ادھر کون رہتا ہے؟"

چوکیدار نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟ کس سے ملنا چاہتے ہو؟"

اس نے فضا میں منہ اٹھا کر دو تین بار سونگھا پھر کہا۔ "میں یقین سے کہتا ہوں اس کوٹھی میں پولیس کے سپرنٹنڈنٹ گابے جی موجود ہیں۔"

چوکیدار نے پریشان ہو کر اسے دیکھا پھر کہا۔ "تم بکواس کرتے ہو' یہ جیلر صاحب کی کوٹھی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں ذرا جیلر صاحب سے ملاقات کروں گا۔"

"تم اندر نہیں آسکتے۔ وہ سو رہے ہیں۔ تمہیں آنا ہو تو بارہ ایک بجے کے بعد آنا۔ وہ دیر تک سوتے ہیں۔"

"ارے وہ سوئے ہیں مرے نہیں ہیں کہ اٹھایا نہ جاسکے۔ گیٹ کھولو' میں اندر جاؤں گا۔"

"گیٹ نہیں کھلے گا۔"

اس نے دونوں ہاتھ گیٹ کی اونچائی پر رکھے پھر یکبارگی اچھل کر اُدھر سے اِدھر چلا آیا۔ چوکیدار نے چیخ کر کہا۔ "ارے ارے کیا کرتے ہو' چور' چور۔"

اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ آنے والے نے ایک ہاتھ سے منہ دبا دیا۔ اس کی فولادی ہتھیلی پورے چہرے پر چھا گئی تھی۔ وہ جیسے شیر کا پنجہ تھا یا آہنی شکنجہ تھا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہو سکا۔ وہ اسے پیچھے کی طرف دھکیلتا ہوا بولا۔ "بس اسی طرح مجھے کوٹھی کے اندر لے چلو' میری گرفت سے نکلنا چاہو گے تو جبڑے ٹوٹ جائیں گے۔ بولنے کے قابل نہیں رہو گے۔"

چوکیدار کا منہ بری طرح دبا ہوا تھا۔ وہ الٹے قدموں پیچھے چل رہا تھا اور منہ دبانے والا اسے دھکیلتا لے جا رہا تھا۔ کوٹھی کے پورچ میں جیل خانے کی ایک بند گاڑی کھڑی ہوئی تھی وہ چوکیدار کو اسی طرح الٹے پاؤں چلاتا ہوا کوٹھی کے اندر لے آیا۔ اندر اور باہر کوئی ملازم دکھائی نہیں دے رہا تھا......... لاؤنج سے ایک زینہ اوپر کی طرف گیا تھا۔ وہ اوپر کی طرف منہ اٹھا کر سونگھنے لگا۔ بُو اسی طرف سے محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چوکیدار کا منہ کھول کر گردن دبوچ لی پھر کہا۔ "آواز نکلے گی تو گردن ٹوٹ بھی سکتی ہے۔"

چوکیدار صرف ایک ہاتھ کی گرفت سے محسوس کر رہا تھا کہ وہ کیسا پہاڑ ہے۔ اس سے ٹکرا کر ہاتھ پاؤں تڑوانا دانشمندی نہیں ہوگی۔ اس لئے وہ چپ چاپ اس کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آ گیا۔ ایک کمرے سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چوکیدار کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر دروازے سے کان لگا کر سننے لگا۔ کمرے کے اندر کوئی دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "یار گابے جی' جلدی باتھ روم سے نکلو۔ تم تو مجھے ڈبو دو گے۔ ساڑھے پانچ ہو چکے ہیں۔ یہاں سے جیل خانے کا راستہ آدھے گھنٹے کا ہے۔ چھ بجے تک اچھا خاصا دن نکل آتا ہے۔ اگر کسی نے یہ دیکھ لیا کہ میں تمہیں جیل خانے سے نکال کر رات کو یہاں لاتا ہوں تو میری نوکری بھی جائے گی اور سزا بھی ہوگی۔"

باتھ روم کے اندر سے کچھ کہا جا رہا تھا آواز آ رہی تھی مگر بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس پہاڑ جیسے شخص نے دروازے کے ہینڈل پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے چوکیدار کو ایک دھکا دیا۔ وہ کھلے ہوئے دروازے سے ٹکراتا ہوا اندر کمرے میں جا کر اوندھے منہ فرش پر گر پڑا۔ کمرے کے اندر جو شخص بول رہا تھا وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ جیلر کی وردی میں تھا۔ ظاہر ہے' جیلر ہی ہوگا۔ اس نے کمرے میں داخل ہونے والے

پہاڑ کو سر سے پاؤں تک حیرانی سے دیکھا پھر ذرا غصے سے پوچھا۔ "کون ہو تم؟ یہاں کیسے آئے ہو؟"

وہ خواہ مخواہ احمقانہ سوال کر رہا تھا۔ جب چوکیدار فرش پر آ کر اوندھے منہ گر پڑا تھا تو سمجھ میں آ گیا تھا کہ آنے والا دوست نہیں ہو سکتا۔ دشمن ہی ہوگا لیکن جیلر آنے والے کو باتوں میں لگا کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک اس کے پیچھے والی دیوار کی طرف جانا چاہتا تھا جہاں ہولسٹر میں اس کا ریوالور رکھا ہوا تھا۔ آنے والے نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "اپنی جگہ رہو گے تو صحیح سلامت رہو گے کمرے سے باہر زبردستی جانا چاہو گے تو ہاتھ پاؤں ٹوٹ سکتے ہیں۔"

جیلر نے غصے سے کہا۔ "جانتے ہو میں کون ہوں؟ میں جیلر ہوں۔ تم میرے گھر میں گھس کر مجھے دھمکی دے رہے ہو۔"

وہ پھر اسے باتوں میں لگا کر آگے بڑھنا چاہتا تھا اس نے جیلر کے سینے پر اپنا بھاری بھرکم پنجہ رکھ دیا۔ جیلر بھی اچھا خاصا تگڑا تھا۔ اس نے اس کے ہاتھ کو ہٹانا چاہا لیکن اس کے ہاتھ کو صرف اِدھر اُدھر ہلا کر رہ گیا۔ اپنے راستے سے ہٹا نہ سکا۔ اس نے ذرا سی جدوجہد میں اندازہ کر لیا کہ پہاڑ کو اس کی جگہ سے ہٹا نہیں سکے گا۔ قریب آ کر مقابلہ کرے گا تو نقصان اٹھائے گا۔ وہ شکست خوردہ انداز میں پیچھے ہٹ گیا لیکن اچانک ہی پلٹ کر ایک کک ماری لیکن مارنے کی حسرت رہ گئی۔ کک مارنے والا پاؤں اس آہنی ہتھیلی کے شکنجے میں آ گیا اب اس کا ایک پاؤں فرش پر تھا اور دوسرا فرش اور چھت کے درمیان۔ وہ ایک ٹانگ پر اچھلتا ہوا غصے سے کہہ رہا تھا۔ "یہ کیا کر رہے ہو۔ چھوڑو میری ٹانگ۔"

اس نے ٹانگ کو ایک جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔ وہ گھومتا ہوا ایک دیوار سے جا ٹکرایا پھر فرش پر گر پڑا۔ اسی وقت باتھ روم کا دروازہ کھلا۔ ایک شخص تولیہ لپیٹے باہر نکل رہا تھا۔ اپنے ساتھی کو فرش پر گرتے دیکھ کر ٹھٹک گیا پھر اس نے سر اٹھا کر آنے والے کو سر سے پیر تک دیکھا۔ آنے والے نے کہا۔ "اچھا تو گابے جی' تم اس شاندار کوٹھی میں سزا کاٹ رہے ہو۔ یہ جیلر تمہیں یہاں لا کر عیاشی کراتا ہے۔ یقیناً پچھلی رات شراب بھی آئی ہوگی' عورت بھی آئی ہوگی تم دونوں میں گہری دوستی معلوم ہوتی ہے۔"

گابے جی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

"میں سرور ہوں سرور' سمجھے؟ جیسے ناک واک' کان وان' سرور' ویسے ہی میرا نام سرور ہے۔"

گابے جی نے پوچھا۔ "تم مجھے کیسے جانتے ہو؟"

"تمہیں کون نہیں جانتا۔ پچھلے کئی ہفتوں سے اخبارات میں تمہاری خبریں شائع ہو رہی ہیں۔ تم سپرنٹنڈنٹ آف پولیس تھے۔ پولیس کی وردی پہن کر تم نے بڑے جرائم کئے' تمہارا فرض تھا جرائم کو ختم کرنا لیکن تم بھاری رشوتیں لے لے کر بڑے بڑے مجرم پیدا کرتے رہے۔ تم پر کئی قتل کے الزامات ہیں۔ میں نے اخبارات میں یہ بھی پڑھا ہے کہ تمہاری ضمانت نامنظور ہو گئی ہے پھر تم جیل سے باہر یہاں کیسے نظر آ رہے ہو؟"

وہ اپنے ساتھی جیلر کو سہارا دے کر فرش پر سے اٹھاتے ہوئے بولا۔ "تمہیں دھوکا ہوا ہے۔ میں گابے جی نہیں ہوں۔ کیا تم نے مجھے کہیں دیکھا ہے یا کہیں میری تصویر دیکھی ہے۔"

سرور نے ذرا سوچتے ہوئے کہا۔ "نہیں' میں نے کبھی تمہاری تصویر نہیں دیکھی اور نہ ہی پہلے کبھی تمہیں دیکھا ہے۔"

"پھر کیسے کہتے ہو کہ میں سابق سپرنٹنڈنٹ آف پولیس' گابے جی ہوں؟"

جیلر نے پوچھا۔ "کیا تم انٹیلی جنس کے آدمی ہو؟"

"میں کسی کا آدمی نہیں ہوں۔ کسی عورت کا آدمی بھی نہیں ہوں۔"

"پھر تم کون ہو؟"

"میں دھوبی ہوں۔"

"کیا؟" دونوں نے حیرانی سے دیکھا۔ انہوں نے آج تک کسی دھوبی کو جوگنگ کے لباس میں نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی کوئی دھوبی ایسا پہاڑ جیسا باڈی بلڈر دکھائی دیا تھا۔ جیلر نے کہا۔ "تم کوئی بھی ہو' ہمیں اس سے مطلب نہیں ہے تم نے زبردستی اس کوٹھی میں داخل ہو کر ایک غیر قانونی حرکت کی ہے۔ میں قانون کا محافظ ہوں۔ تمہیں ابھی گرفتار کرا سکتا ہوں لیکن یہ سوچ کر معاف کر رہا ہوں کہ کسی دھوکے میں چلے آئے ہو لہٰذا یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔"

"میں دھوکا نہیں کھا رہا ہوں۔ یہ گابے جی ہے۔"

"تم پاگل کے بچے ہو۔ جانتے نہیں' پہچانتے نہیں' کبھی گابے جی کی تصویر نہیں دیکھی ہے اور خواہ مخواہ میرے دوست پر شبہ کر رہے ہو۔"

"تم لوگوں نے حبیب اسکوائر کے راؤنڈ اباؤٹ کے قریب ہی ایک بہت بڑی لانڈری کی دکان دیکھی ہوگی۔ اس کا نام ہے سرور ڈرائی کلینرز۔ میں باڈی بلڈر ہوں۔ صرف اپنی جان بنانا چاہتا ہوں۔ نہ ملازمت کرنا چاہتا ہوں نہ ہی کوئی کاروبار لیکن میری خوراک بہت ہے۔ میں روز صبح دوڑ لگانے اور ورزش کرنے کے بعد ایک کلو سیب کھاتا ہوں اور دو کلو دودھ پیتا ہوں۔"

انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔ "ایک کلو سیب اور دو کلو دودھ؟"

اس نے کہا۔ "یہ میرا ہلکا سا ناشتا ہے میں صبح سے رات تک اپنے کھانے کی تفصیل نہیں بتا سکتا۔ اتنا سمجھ لو کہ میرے اخراجات کوئی برداشت نہیں کر سکتا اور میری آمدنی بھی اتنی نہیں ہے۔ ماموں نے کہا۔ وہ ساری زندگی میرے اخراجات برداشت نہیں کر سکیں گے۔ لہٰذا انہوں نے میرے لئے ایک لانڈری کھول دی مجھے سمجھایا کہ پہلوانی سے فرصت ملتے ہی میں دکان میں رہا کروں اور وہاں کا کاروبار سمجھا کروں۔ دکان میں بھروسے کے ملازم ہیں۔ پہلے پہل میں نے ایک ہیرا پھیری کرنے والے ملازم کا ہاتھ توڑ دیا تھا۔ دوسرے کی صورت بگاڑ دی تھی۔ اس کے بعد کوئی مجھے دھوکا دینے کی جرأت نہیں کرتا ہے پھر بھی میں کبھی کبھی لانڈری میں جاتا ہوں۔"

جیلر نے کہا۔ "ارے تم اپنی یہ روداد ہمیں کیوں سنا رہے ہو؟ خدا کے لئے پیچھا چھوڑو اور جاؤ یہاں سے۔"

"میں بتانا چاہتا ہوں کہ یہ شخص گابے جی ہے۔"

"ارے تو گابے جی کا تعلق تمہاری لانڈری سے کیا ہے۔؟"

"اس کے کپڑے میرے پاس دھلنے آیا کرتے تھے کم بخت کے میلے کپڑوں میں ایسی بو ہوتی تھی کہ سب سے الگ پہچانی جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا یہ سڑی ہوئی مچھلیاں کھاتا ہے یا مچھلیاں اس کے پیٹ میں جانے کے بعد سڑ جاتی ہیں اور اپنی ساری سڑی گلی بدبو اس کے پسینے میں چھوڑ جاتی ہیں۔ میں دکان کے کسی بھی گوشے میں ہوتا تھا اور اس کا

ملازم کپڑے لے کر آتا تھا تو میں دور ہی سے کاؤنٹر مین سے پوچھتا تھا۔ کیا گابے جی کے کپڑے آئے ہیں؟

کاؤنٹر مین اس کی تائید کرتا تھا۔ اس سے تم اندازہ کرسکتے ہو کہ یہ بدبو میرے دماغ میں کیسے چبھنے لگی ہے۔ میں اسے ہزاروں لاکھوں میں پہچاننے لگا ہوں۔"

جیلر اور گابے جی اس کی بات توجہ سے سن رہے تھے اور اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "گابے جی کی شامت آئی تھی کہ ٹھیک ایسے وقت پر اپنے کپڑے اتار کر غسل خانے میں گیا تھا جب کہ میں یہاں سے دوڑتا ہوا گزر رہا تھا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اس کے میلے کپڑوں سے بدبو کا بھبکا آرہا تھا۔ تم لوگ اس کے پاس رہ کر شاید یہ بو محسوس نہیں کرتے یا نظرانداز کردیتے ہو۔ میں سونگھنے کی غیر معمولی حس رکھتا ہوں۔ پھر جو چیز مجھے ناپسند ہوتی ہے' وہ دماغ میں چبھنے لگتی ہے اور یہی گابے جی کی کم بختی ہے۔"

گابے جی نے ہنستے ہوئے آگے بڑھ کر دوستانہ انداز میں مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا پھر کہا۔ "بھئی یہ بات ہے تو پہلے کہنا چاہئے تھا دراصل میں کوڈلیور آئل پیتا ہوں۔ اس دوا میں مچھلی کا تیل ہوتا ہے.......... اس وجہ سے میرے پسینے سے بھی یہی بو آنے لگی ہے۔ پتا نہیں وہ گابے جی کیسی کیسی سڑی مچھلیاں کھاتا ہوگا۔ میں تو کبھی مچھلی کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ ڈاکٹر کی ہدایت سے مجبور ہوں۔ اس لئے کوڈلیور آئل پی لیتا ہوں چلو کوئی بات نہیں تمہیں غلط فہمی ہوئی تھی۔ ہم دوست ہیں۔"

سرور نے مصافحہ کے لئے اس کا ہاتھ پکڑا تو پھر وہ چھڑا نہ سکا۔ اپنا ہاتھ بار بار کھینچتے ہوئے بولا۔ "یہ کیا مذاق ہے؟ ہاتھ چھوڑو۔"

"اگر ثابت نہ ہوا کہ تم گابے جی ہو تو چھوڑ دوں گا۔ اپنے کسی سینئر افسر کا ٹیلیفون نمبر بتاؤ۔ میں اسے پولیس والوں کے ساتھ آنے کے لئے کہوں گا۔ وہ تمہیں دیکھتے ہی پہچان لے گا تم گابے جی نہ ہوئے تو گرفتار نہیں کرے گا۔"

گابے اور جیلر نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر جیلر نے کہا۔ "ہاں اس طرح ہم اپنے افسران کے ذریعے ثابت کرسکتے ہیں کہ یہ گابے جی نہیں ہے' چلو میں تمہارے سامنے ٹیلیفون پر بات کرتا ہوں۔"

وہ انکار میں سرہلا کر بولا۔ "نہیں' مجھے نمبر بتاؤ' میں بات کروں گا۔ پتا نہیں' تم کسے فون کرو گے اور میرے سامنے سنانے کے لئے اسے اپنا آفیسر کہہ دو گے۔ وہ تمہارے ماتحت سپاہیوں کو لے کر آئے گا۔ بے چارے سپاہی اپنے افسران سے ڈرتے ہیں۔ وہ ڈر کے مارے تمہیں گابے جی نہیں کہیں گے۔"

جیلر نے اسے ایک ٹیلیفون نمبر بتایا پیچھے دیوار سے ہولسٹر لٹک رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر ریوالور نکالا پھر کہا۔ "اگر کوئی چالاکی دکھاؤ گے تو میں گولی ماردوں گا۔"

وہ ٹیلیفون کے پاس آیا پھر کہا۔ "تم دونوں میرے سامنے فرش پر بیٹھو۔"

جیلر اور گابے جی نے بھڑک کر کہا۔ "کیا تم ہمیں ملزم سمجھتے ہو؟ ہم پولیس کے سینئر آفیسر ہیں۔ تم ہمیں نیچے بیٹھنے کے لئے کہہ رہے ہو۔ تمہاری شامت آگئی ہے۔"

سرور نے کہا۔ "گابے جی' تم خود کو روانی میں پولیس کا سینئر آفیسر کہہ چکے ہو لہٰذا ملزموں کی طرح بیٹھ جاؤ اور جیلر تم بھی۔"

وہ دونوں اسے قہرآلود نظروں سے گھورتے ہوئے فرش پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے پھر انتظار کرنے لگا۔ دوسری طرف تھوڑی دیر تک گھنٹی بجتی رہی پھر کسی نے ریسیور اٹھا کر جھلائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "کون ہے؟ اتنی صبح کون ڈسٹرب کررہا ہے؟"

"جناب' اگر آپ پولیس کے اعلیٰ آفیسر سلطان بیگ ہیں تو آپ کے لئے چونکا دینے والی خبر ہے بلکہ ایک اہم اطلاع ہے۔ اگر آپ فوراً قانونی کارروائی کریں گے تو آپ کی ترقی بھی ہوگی اور آپ کو شہرت بھی ملے گی۔"

"ہاں' ہاں میں سلطان بیگ بول رہا ہوں۔ تم کون ہو' کیا اطلاع ہے؟"

"آپ لوگوں کا سابق سپرنٹنڈنٹ آف پولیس گابے جی جیل کی آہنی سلاخوں سے نکل کر ایک کوٹھی میں عیش وعشرت کی رات گزارنے آیا تھا میں نے اسے پکڑ رکھا ہے۔"

"اگر تم نے اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے تو مجھے یقین دلانے کے لئے گابے جی کی آواز سناؤ۔"

سرور نے گابے کی طرف دیکھا پھر انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ادھر آؤ۔"

وہ اٹھ کر ٹیلیفون کے پاس آیا۔ سرور نے کہا۔ "اب تمہیں پتا چلے گا سلطان بیگ

سے باتیں کرو۔"

گابے جی نے ریسیور لے کر کان سے لگایا پھر کہا۔ "سر' میں گابے جی بول رہا ہوں۔ میرے ساتھ جیلر جبار خان ہے۔ یہ بھی میری وجہ سے پھنسنے والا ہے۔ ہم سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ پلیز کچھ کیجئے۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہوا۔ دوسری طرف کی باتیں سننے لگا۔ سرور غور سے گابے جی کا منہ تک رہا تھا۔ اس کے چہرے سے سمجھنا چاہتا تھا کہ دوسری طرف سے کیا کہا جارہا ہے لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ پھر گابے نے ریسیور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "صاحب تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

اس نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "جی جناب' میں سرور بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے پولیس آفیسر سلطان بیگ نے پوچھا۔ "سرور؟ یہ سرور کیا ہوتا ہے؟"

"جناب' میں وہی آدمی ہوں جو ابھی تھوڑی دیر پہلے فون پر آپ کو گابے جی کے متعلق اطلاع دے رہا تھا۔"

"اچھا تو تم وہی اطلاع دینے والے ہو۔ تمہارا نام سرور ہے۔ بھئی تم نے تو کمال کردیا۔ بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہیں رہو اور گابے پر نظر رکھو۔ میں سپاہیوں کو لے کر آتا ہوں۔

سرور نے کہا۔ "جناب کوٹھی کا نمبر اور پورا پتا نوٹ کرلیجئے۔"

"میں جیلر جبار خان کی کوٹھی کا پتا جانتا ہوں۔ ابھی آرہا ہوں۔"

سرور نے ریسیور رکھ کر فاتحانہ انداز میں گابے اور جیلر جبار خان کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب تم لوگوں کی شامت آرہی ہے۔ ابھی تم نے خود کو گابے جی تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ دیکھو' فون پر اس آفیسر نے تمہاری آواز سنتے ہی تمہیں پہچان لیا۔ اب بتاؤ قانون کی آنکھوں میں کیسے دھول جھونک سکو گے؟"

گابے جی نے کہا۔ "مسٹر سرور! اتنا تو ہمیں معلوم ہوگیا کہ تم انٹیلی جنس کے آدمی نہیں ہو' تم تھانے کے مخبر بھی نہیں ہو' تم ایک سیدھے سادے شہری ہو' خوب کھاتے ہو اور اپنی جان بناتے ہو' تمہیں دنیا والوں سے کیا لینا دینا ہے۔ البتہ ہم سے بہت اچھا نین

دین ہوسکتا ہے۔"

جیلر جبار نے کہا۔ "ابھی تم نے کہا تھا کہ تمہاری خوراک غیر معمولی ہے۔ کوئی دوسرا تمہارے کھانے پینے کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتا۔ ہم برداشت کرسکتے ہیں۔ بلکہ ہمیں بھی برداشت نہیں کرنا ہوگا۔ ہم تمہارے لئے آمدنی کا ایسا ذریعہ بنادیں گے کہ گھر بیٹھے ماہانہ بیس پچیس ہزار اور کبھی کبھی پچاس ہزار بھی کمالیا کرو گے۔"

"میں تم دونوں سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ ایسی اندھی آمدنی کے ذرائع کیسے بن جاتے ہیں اور تم لوگ کیسے بناؤ گے۔ اس اندھیر نگری میں اب یہ کوئی نئی بات نہیں رہی۔ موٹی عقل والے بھی سمجھ لیتے ہیں کہ نشے کی ایک پڑیا بیچنے سے کم از کم بیس روپے ضرور مل جاتے ہیں۔"

گابے جی نے کہا۔ "سرور بھائی! یہ تو بہت چھوٹی سی بات ہے' بھلا بیس روپے کی پڑیا بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ تمہارا قد پہاڑ جیسا ہے۔ پہاڑ جیسے مضبوط اور اپنی جگہ اٹل رہنے والے آدمی ہو۔ بڑے بڑے بدمعاش تمہیں دیکھ کر گھٹنے ٹیک دیں گے۔ ہم تمہیں ایک بہت بڑے علاقے کا دادا بنادیں گے۔ تمہارے پاس گھر بیٹھے بڑی بڑی رقمیں پہنچتی رہا کریں گی۔"

دوسرے نے کہا۔ "الیکشن کے زمانے میں تمہاری چاندی ہی چاندی ہوگی۔ واہ واہ بھی ہوگی' شہرت بھی ملے ہوگی.......... لیڈر تمہارے دروازے پر آیا کریں گے۔ منسٹر بننے کا خواب دیکھنے والے تمہارے پاس لاکھوں روپے کی گڈیاں لے کر آئیں گے کیوں کہ تم جس امیدوار کو ووٹ دینے جاؤ گے تمہارے پیچھے پورا علاقہ اسی کو ووٹ دینے جائے گا۔"

وہ دونوں باری باری بولتے جارہے تھے۔ ایک نے کہا۔ "ہماری بات پر ٹھنڈے دل سے' ٹھنڈے دماغ سے غور کرو' کسی بھی بڑے علاقے کا دادا صرف غنڈوں کا سردار نہیں ہوتا۔ وہ ایک معزز انسان ہوتا ہے جس کے دروازے پر مستقبل کے وزراء اور اعلیٰ حکام آتے ہیں کیونکہ وہ صرف ایک بدنام دادا نہیں ہوتا کنگ میکر بھی ہوتا ہے جو اپنے علاقے کے ووٹوں سے کسی کو بادشاہ بناکر تخت پر بٹھاتا ہے اور کسی کا تختہ کردیتا ہے۔"

سرور نے دونوں کو باری باری دیکھ کر کہا۔ "تم دونوں ہی بہت بڑے پولیس والے تھے۔ اب مجرم بن چکے ہو لیکن پولیس والے ہوتے ہو تو اخباروں کے ذریعے اعلان کرتے

ہو کہ عوام پولیس سے تعاون کرے پھر بیان دیتے ہو کہ اس اندھیر نگری سے جرائم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکو گے اور اسے روشن نگری بنا دو گے۔ بیان دے کر پھر عوام سے اپیل کرتے ہو کہ ہم سے جو کوئی مجرموں کی نشاندہی کرے گا اسے انعام بھی دیا جائے گا اور اس کا نام اور پتا ٹھکانا راز میں رکھا جائے گا۔ اس کی نشاندہی کے مطابق جس مجرم پر مقدمہ چلے گا' اس میں پولیس سے تعاون کرنے والے کو ملوث نہیں کیا جائے گا۔ اسے پوری طرح تحفظ دیا جائے گا۔"

وہ دونوں کو گھورتے ہوئے بولا۔ "مگر تم لوگ کرتے کیا ہو۔ مجرموں کی نشاندہی کرنے والے کو مجرمانہ آمدنی کا لالچ دیتے ہو پھر رفتہ رفتہ اسے بھی مجرم بنا دیتے ہو۔ اگر وہ کسی لالچ میں نہ آئے تو اسے الٹے سیدھے کیس میں پھنسا کر جیل پہنچا دیتے ہو اور جیل تو جرائم کی یونیورسٹی ہے جہاں سے شریف آدمی بھی بدمعاش بن کر ہی نکلتا ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہولسٹر کے پاس آیا پھر اس میں ریوالور رکھنے کے بعد پلٹ کر بولا۔ "کیا تم نے کبھی یہ سوچا کہ اخبارات میں اتنی اپیلیں کرنے کے بعد بھی عوام تم لوگوں سے تعاون کیوں نہیں کرتے؟"

وہ اور کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن افسر اعلیٰ سلطان بیگ سپاہیوں کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ سلطان بیگ نے سرور کو دیکھ کر کہا۔ "یہاں تین ہی بندے ہیں جن میں سے دو مجرم ہیں اور ایک تم ذمے دار اور فرض شناس شہری ہو۔ یقیناً تم ہی سرور ہو۔"

"جی ہاں جناب' میں نے ہی آپ کو اطلاع دی تھی۔"

اس نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے شاباش دی۔ پھر اپنے ساتھ آنے والے ایک شخص سے کہا۔ "مسٹر سرور کا بیان حرف بہ حرف لکھو اور ان سے دستخط لو۔"

دوسرا شخص ایک فوٹو گرافر تھا۔ وہ سلطان بیگ کے حکم سے جیلر جبار خان' گابے جی' سرور اور سلطان بیگ وغیرہ کی تصویریں اتارنے لگا۔ گابے جی نے سلطان بیگ سے کہا۔ "میری وردی اتر چکی ہے.......... پہلے تم میرے جونیئر تھے۔ اب میرے عہدے پر ترقی ملی ہے۔ میں آج تمہارا سینئر نہ سہی لیکن بزرگ ہوں۔ تم سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اور میرے ساتھی کو جو سزا دینا چاہو' اسی چاردیواری میں دے دو اور بات یہیں

ختم کر دو۔"

سلطان بیگ نے کہا۔ "بات ختم کرنے کا معاوضہ تم لوگوں نے مسٹر سرور کو بھی دینے کی کوشش کی ہوگی۔"

سرور نے کہا۔ "جی ہاں جناب' یہ مجھے بڑے سے بڑا لالچ دے رہے تھے۔"

سلطان بیگ نے کہا۔ "بڑے شرم کی بات ہے۔ آج پولیس والے تمہاری وجہ سے بدنام ہو رہے ہیں۔ عوام کا اعتماد ہم پر سے اٹھ گیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پانچوں انگلیاں برابر ہیں۔ ہم سب ہی اس وردی میں شیطانی کردار ادا کر رہے ہیں۔ ہم میں سے کوئی انسان نہیں ہے۔ پولیس ڈپارٹمنٹ کے باہر یہ بندہ سرور انسان ہے۔ میں یہ ثابت کروں گا کہ اس ڈپارٹمنٹ کے اندر میں اس وردی میں انسان ہوں۔ میں نے تمام اعلیٰ افسران تک یہ اطلاع پہنچا دی ہے۔ مجھے توقع ہے' ہمارا کوئی موسٹ سینئر آفیسر یہاں پہنچنے والا ہے۔"

سرور کا بیان مکمل ہونے کے بعد گابے جی اور جیلر جبار خان کا بھی بیان لیا گیا۔ ان کے دستخط بھی کرائے گئے۔ اتنے میں ایک سپاہی دوڑتا ہوا آیا۔ پھر اس نے اطلاع دی کہ پولیس ڈپارٹمنٹ کے عالی جناب تشریف لا رہے ہیں۔ سرور نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ نیچے کا مین گیٹ کھل گیا تھا۔ پولیس کی گاڑیاں داخل ہو رہی تھیں۔ دوسرے سپاہی جو باہر کھڑے تھے' سب الرٹ ہو کر سیلوٹ کر رہے تھے۔

پولیس کی گاڑیوں کے درمیان عالی جناب کی ایک بہت ہی قیمتی کار تھی۔ جب وہ رکی تو سپاہی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص وردی میں ملبوس تھا۔ وہ شاہانہ انداز میں چلتا ہوا کوٹھی میں داخل ہوا۔ پھر زینے پر چڑھتا ہوا اوپری منزل کے اسی کمرے میں آیا جہاں سرور وغیرہ موجود تھے۔ وہاں بھی سب نے اٹین شن ہو کر اسے سیلوٹ کیا۔ عالی جناب کا بڑا سا چہرہ تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں تھیں بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ بڑا سا سر تھا۔ یقیناً دماغ بھی بڑا ہو گا اسی لئے وہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے عالی جناب بنائے گئے تھے۔

انہوں نے بڑی بڑی آنکھوں سے گھور کر گابے جی اور جبار خان کو دیکھا پھر غرانے کے انداز میں سلطان بیگ سے پوچھا۔ "کیا تحریری کارروائی مکمل ہو چکی ہے؟"

"جی ہاں جناب' یہ ان تینوں کے بیانات ہیں۔ ان کے دستخط بھی ہیں۔ میں نے بھی دستخط کردیئے ہیں' آپ بھی دستخط کردیں گے تو کاغذی کارروائی مکمل ہوجائے گی۔"

اسی دوران فوٹو گرافر ان کی تصویریں' دونوں ملزموں کے ساتھ اتار رہا تھا۔ انہوں نے سلطان بیگ سے پوچھا۔ "یہاں فوٹو گرافر کی کیا ضرورت تھی؟ میں اس معاملے کو پبلسٹی دینا نہیں چاہتا۔ ہم پولیس والے پہلے ہی بدنام ہیں۔ ان دونوں کو فائل مکمل کرنے کے بعد ان کا کیس عدالت تک پہنچایا جائے گا اور وہاں بھی ہماری کوشش یہی ہوگی کہ اخبارات والے اس بات کو زیادہ نہ اچھالیں۔"

سلطان بیگ نے ادب سے کہا۔ "جناب' آپ وہی کریں گے جو بہتر سمجھتے ہیں لیکن میرا فرض ہے کہ میں ہر پہلو سے.......... کارروائی مکمل کروں۔ تحریری بیانات ہوچکے ہیں۔ میں تصویریں بھی اس فائل میں شامل کروں گا اور یہ فائل مکمل کرکے آپ کے پاس روانہ کردوں گا۔ پلیز دستخط کردیں۔"

عالی جناب نے ہچکچاتے ہوئے ان بیانات پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ پھر دستخط کردیئے اور سختی سے تاکید کی۔ "یہ فائل مس ہینڈل نہ ہونے پائے۔ جتنی تصویریں اتاری جارہی ہیں۔ ان میں سے ایک بھی کسی غیر ذمے دار افسر کے ہاتھ نہ لگے۔ فوٹو گرافر سے کہو' دوپہر تک پرنٹ تیار کرے اور تم شام تک فائل مکمل کرکے میرے پاس بھیج دو۔"

وہ حکم صادر کرنے کے بعد جانے لگے۔ سلطان بیگ نے ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "جناب' یہ مسٹر سرور ہیں۔ انہوں نے ہی اطلاع دی تھی۔ یہ بہت دلیر ہیں' بہت شہ زور ہیں۔ تنہا ہوکر دونوں کو اپنی گرفت میں رکھا تھا۔"

عالی جناب چلتے چلتے رک گئے تھے۔ سرور کو سر سے پاؤں تک یوں دیکھ رہے تھے جیسے اب تک دیکھا نہ ہو۔ حالاں کہ وہ دو چار بار اس پر نظر ڈال چکے تھے۔ انہوں نے غرا کر کہا۔ "ہوں' اچھی بات ہے۔ بہت اچھی بات ہے۔ شہریوں کو پولیس سے تعاون کرنا چاہئے۔ مسٹر بیگ' اس جوان کو اپنے دفتر لے جاؤ اور اس کیس کے متعلق تمام باتیں اچھی طرح سمجھا دو۔"

وہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد سلطان بیگ نے کہا۔ "مسٹر سرور! میں ان ملزموں کو اپنی نگرانی میں تھانے لے جاؤں گا۔ وہاں بھی ضروری کارروائی ہوگی۔ کیا تم دو

گھنٹے بعد اس پتے پر مجھ سے ملاقات کرسکتے ہو؟"

اس نے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر اسے دیا' اس نے کارڈ لے کر اسے پڑھا پھر جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "میں دو گھنٹے بعد وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

وہ مصافحہ کرکے کوٹھی سے باہر آگیا۔ ابھی ایک میل کی دوڑ باقی تھی۔ دو ملزموں کے خلاف گواہی میں دس بج گئے تھے۔ وہ باہر نکلا تو اچھی خاصی دھوپ نکل آئی تھی۔ پھر بھی وہ باقی دوڑ پوری کرنے کے لئے آہستہ آہستہ دوڑتے ہوئے مین گیٹ سے باہر آیا۔ دور تک لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ جس کوٹھی سے وہ نکل رہا تھا' وہاں خاصی بڑی تعداد میں.......... پولیس والے آئے تھے اور یہ آس پاس کی کوٹھیوں والوں کے لئے تشویش کی بات تھی۔ جو لڑکیاں اسے برسوں سے دیکھتی آرہی تھیں وہ سوچ رہی تھیں۔ کم بخت کبھی آنکھ اٹھا کر ہماری طرف دیکھتا نہیں تھا۔ آج اس نے کسی کو دیکھا بھی اور اس کی کوٹھی میں گیا بھی تو چاروں طرف سے پولیس والوں نے گھیر لیا پتا نہیں' وہ کون خوش نصیب حسینہ ہوگی جو اس جیالے کے ساتھ بدنام ہورہی ہے۔ کیا یہ جذباتی بدنامی ہمارے نام نہیں آسکتی تھی؟

جب وہ تنہا کوٹھی سے دوڑتا ہوا نکلا تو سوچنے والیاں حیران رہ گئیں۔ آخر اس کوٹھی میں کیا ہوا تھا اور اب تک کیا ہو رہا تھا کہ پولیس والے موجود تھے اور وہ جیسا دوڑتا ہوا گیا تھا ویسے ہی دوڑتے ہوئے نکل آیا تھا اور اب ان کی گلیوں سے بھی دوڑتا چلا جارہا تھا۔

بیگم خالدہ امانت نے ایک سرد آہ بھری اور کھڑکی کا پردہ برابر کردیا۔ اس نے اب سے چار برس پہلے سرور کو دیکھا تھا۔ وہ ہر روز صبح اپنی بالکونی میں ٹہلنے کی عادی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کوٹھی کے اوپری حصے سے اتر کر باہر جائے اور کھلی فضا میں چہل قدمی کرے لیکن ڈر لگتا تھا۔ وہ ایک امیر ترین عورت تھی۔ دولت کا کوئی حساب نہیں تھا۔ اگر وہ صبح کے سناٹے میں گھومنے پھرنے نکلتی تو کوئی اسے قتل کرسکتا تھا۔ شوہر کے مرنے کے بعد کئی رشتے دار اس کی دولت کے حقدار بننا چاہتے تھے۔ انہیں یہ حق اس وقت ملتا جب وہ مرجاتی یا قتل ہوجاتی۔ اس نے اپنی حفاظت کے لئے کئی مسلح محافظ رکھے تھے۔ ایک خاص باڈی گارڈ بھی تھا۔ جب وہ کسی تقریب میں شریک ہونے کے لئے یا کہیں شاپنگ وغیرہ کے

لئے باہر نکلتی تو وہ خاص باڈی گارڈ اس کے ساتھ ہوتا تھا' لیکن ایک دن وہ قتل کردیا گیا۔ پولیس والوں کا خیال تھا کہ وہ اندھی گولی خالدہ کے لئے آئی تھی لیکن باڈی گارڈ کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اپنی باڈی سلامت رہے اور آنے والی تمام بلائیں گارڈ کے سر ہوجائیں۔

خالدہ کو اس کی موت کا بہت افسوس ہوا تھا۔ بے چارہ بہت وفادار تھا۔ جاں نثاری کا ثبوت دے گیا تھا۔ اس نے اس کی بیوی بچوں کے لئے ماہانہ معقول رقم مقرر کردی تھی اسے یہ خیال پریشان کرتا تھا کہ آخر کب تک وہ ایک باڈی گارڈ کی محتاج رہے گی اور کوئی اس کی حفاظت کرنے والا اپنی جان سے جاتا رہے گا اور کوئی ضروری نہیں کہ حفاظت کرنے والا ہی اس کی موت کو اپنے سر لیتا رہے۔ کوئی اندھی گولی اس کی زندگی کا بھی خاتمہ کرسکتی ہے۔

وہ پچیس برس کی بھرپور جوان عورت تھی۔ خدا نے حسن بھی دیا تھا۔ چہرے پر دولت کی چکنائی ایسی تھی کہ نظریں پھسل پھسل جاتی تھیں۔ وہ صرف تین برس تک سہاگن رہی تھی' اس کے بعد بیوہ ہوگئی تھی اور بیوگی نے اور غضب ڈھایا تھا۔ وہ ہر رات تنہائیوں اور محرومیوں کی آگ میں پکتی تھی اور ہر روز پکی پکائی ہانڈی کی طرح دور تک اپنی خوشبو کا پتا دیتی تھی۔

جب اس نے پہلی بار سرور کو دور سے دوڑ کر آتے دیکھا تو اس پر سے نظریں نہ ہٹا سکی۔ وہ اوپر بالکونی میں تھی اور سرور نیچے گلی میں دوڑتا ہوا جارہا تھا۔ جب وہ سامنے والی گلی سے گزرا تو اس سے کوئی پندرہ بیس گز کا فاصلہ تھا۔ وہ صاف طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ پہاڑ جیسا قد تھا۔ چٹان جیسا مضبوط جسم تھا۔ اس کے بھاری قدموں کی دھمک دل تک پہنچتی تھی اور اس' کے ہانپنے کی آواز ایسی تھی کہ کوئی نامعلوم سا درندہ حواس پر چھاجاتا تھا۔

وہ اٹھارہ برس کی عمر میں دلہن بنی تھی اور اکیس برس کی عمر میں بیوہ ہوگئی تھی۔ اب اسے شادی کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ اس کے سسرالی رشتے داروں میں کتنے ہی جوان تھے۔ ان کی طرف سے رشتے آتے ہی رہتے تھے اور وہ انکار کردیتی تھی۔ اس کا مرحوم شوہر بہت بڑا زمیندار تھا۔ مرنے سے پہلے اپنی تمام زمینیں اور جائیداد اور شہر کا فائیو اسٹار ہوٹل اس کے نام لکھ گیا تھا۔ اس کے پاس دولت ایسے آئی تھی جیسے پاؤں

تلے تیل کے کنویں بچھے ہوں۔ جب دولت آتی ہے تو عقل بھی آتی ہے۔ اس نے سپرنٹنڈنٹ آف پولیس سلطان بیگ کو اپنا بڑا بھائی بنالیا تھا۔ اس کے ذریعے ایسے کام کے ایماندار آدمی ملازم رکھے تھے جو اس کی آمدنی میں ہیرا پھیری نہیں کرتے تھے۔ کرنے والے سلطان بیگ سے ڈرتے تھے کیونکہ دولت کی آمد و خرچ کا تمام حساب ایک پولیس آفیسر کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ خالدہ نے ایک تیر سے دو شکار کئے تھے۔ ایک تو اپنی دولت اور جائیداد کو اطمینان بخش طریقوں سے محفوظ کردیا تھا۔ دوسرے انجانے اور ان دیکھے قاتلوں کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ ایس پی سلطان بیگ کی بہن پر گولی چلانا اب اتنا آسان نہیں رہا ہے۔

دن کے بارہ بج رہے تھے۔ وہ ایک ہینگنگ چیئر پر بیٹھی آہستہ آہستہ جھولتی ہوئی اپنی زمینوں کا حساب دیکھ رہی تھی۔ ایسے میں کال بیل کی آواز سنائی دی۔ اس نے سر اٹھا کر ایک طرف دیکھا پھر سر جھکا کر حساب دیکھنے میں مصروف ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک ملازم نے کہا۔ "آپ سے ایک صاحب ملنا چاہتے ہیں۔ اپنا نام سرور بتا رہے ہیں۔"

خالدہ نے ذہن پر زور ڈال کر سوچا۔ اسے سرور نام کا کوئی شناسا یاد نہیں آیا۔ اس نے کہا۔ "یہ کون صاحب ہیں' کیوں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟ سیکرٹری سے کہو' ان سے بات کرے۔"

ملازمہ نے ایک کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "وہ یہ وزیٹنگ کارڈ ساتھ لائے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ کے بھائی سلطان بیگ نے یہاں آنے کے لئے کہا تھا۔"

خالدہ ہینگنگ چیئر سے اتر کر ٹیلیفون کے پاس آئی وہاں آرام سے بیٹھ کر ریسیور اٹھایا۔ نمبر ڈائل کئے۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے کہا۔ "بھائی صاحب' السلام علیکم' کیا آپ نے کسی سرور نامی شخص کو میری کوٹھی بھیجا ہے؟"

"اوہ خالدہ' سو سوری' میں دو ملزموں کی فائل مکمل کرنے میں اس قدر مصروف ہوگیا کہ تمہیں فون پر پہلے سے اطلاع نہ دے سکا۔ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ وہ ہمارے بہت کام کا آدمی ہے۔ میں آدھے گھنٹے میں پہنچنے کی کوشش کررہا ہوں۔"

اس نے ریسیور رکھ کر ملازمہ سے کہا۔ "اسے ڈرائنگ روم میں لے جاؤ اور چائے وغیرہ پیش کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

ملازمہ چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آکر بولی۔ "بیگم صاحبہ' وہ تو عجیب آدمی ہیں۔ چائے نہیں پیتے' دودھ پیتے ہیں۔"

"اس میں عجیب بات کیا ہوئی۔ تم ذرا ذرا سی بات پر مجھے ڈسٹرب کرنے کیوں آتی ہو۔ دیکھ نہیں رہی ہو' میں حساب کتاب میں مصروف ہوں۔"

"معافی چاہتی ہوں۔ میں نے ان سے پوچھا تھا۔ کیا ایک کپ دودھ کافی ہوگا؟ انہوں نے کہا۔ وہ کپ اور گلاس سے نہیں' بالٹی سے پیتے ہیں۔"

خالدہ نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ "کیا؟"

"میں سچ کہتی ہوں۔ یہ بات وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں اور کہتے ہیں' کسی کے گھر جاکر کھانے پینے کی عادت نہیں ہے۔ چونکہ میں نے انہیں چائے کے لئے پوچھا تھا' اس لئے وہ اپنی خوراک بتارہے ہیں۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ملازمہ نے ریسیور اٹھا کر سنا پھر اسے خالدہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ کے بھائی صاحب ہیں۔"

اس نے ریسیور کان سے لگاکر سنا۔ سلطان بیگ کہہ رہا تھا۔ "ابھی ابھی عالی صاحب نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا ہے۔ میں ابھی وہاں جارہا ہوں۔ واپسی میں ذرا دیر ہوگی۔ سرور ایک سچا محب وطن ہے۔ تم اس سے اپنی خفیہ تنظیم سے متعلق گفتگو کرو لیکن پہلے بھانپ لو کہ وہ ہماری تنظیم کے مزاج کے مطابق ہے یا نہیں۔"

"کیا وہ ضرورت مند یا محتاج ہے؟"

"نہیں' وہ ایک اچھی فیملی سے تعلق رکھتا ہے لیکن خود کو دھوبی کہتا ہے۔ ایک بہت بڑی لانڈری کا مالک ہے۔ اچھا کھاتا پیتا ہے۔ اگر اس کی آمدنی کا ذریعہ نہ ہوتا تب بھی وہ بکنے والوں میں سے نہیں ہے۔"

"اچھی بات ہے' میں اسے ہینڈل کرلوں گی۔"

اس نے ریسیور رکھ کر ملازمہ کو دیکھا اور کہا۔ "ہمارے ہاں روزانہ چار کلو دودھ آتا ہے۔ صبح سے دو کلو ختم ہوچکا ہے' باقی دو کلو سب سے چھوٹی بالٹی میں آئے گا۔ میں اسی بالٹی میں مہمان کے لئے لے جاتی ہوں۔"

ملازمہ چلی گئی۔ خالدہ وہاں سے اٹھ کر زمین کے تمام ضروری کھاتوں کو سمیٹ کر

ایک طرف رکھنے کے بعد.......... ڈرائنگ روم کی طرف آئی۔ سرور کے سامنے جانے سے پہلے وہ اسے چھپ کر دیکھنا چاہتی تھی تاکہ اس کے متعلق کچھ اندازہ کرسکے۔ اس نے دروازے کی آڑ سے دیکھا پھر اس پر نظر پڑتے ہی دل دھک سے رہ گیا۔ یہ تو وہی قد آور' پہاڑ جیسا جوان تھا جسے وہ پچھلے چار برسوں سے بلا ناغہ ہر صبح دیکھتی آرہی تھی۔ اسے ایک ایسے ہی جیون ساتھی کی ضرورت تھی لیکن وہ اتنی جلدی شادی کا فیصلہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ خوب سوچنا سمجھنا ضروری تھا۔ کوئی اس کی بے انتہا دولت کا مالک بن جاتا' کوئی بات نہ تھی لیکن کسی کو اپنے جسم و جان کا مالک بنانے کے لئے بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہتی تھی۔

اس نے ان چار برسوں میں اپنی دولت سے قیمتی سے قیمتی چیزیں خریدی تھیں۔ جن چیزوں کو بیچنے سے انکار کیا گیا تھا' اس نے انہیں بھی خرید لیا تھا۔ وہ چاہتی تو سرور کے متعلق بہت ساری معلومات حاصل کرسکتی تھی اور اسے خریدنے کی کوشش کرسکتی تھی لیکن وہ محبت کرنا چاہتی تھی شادی کرنا چاہتی تھی۔ ایک اچھی گھریلو زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ اگر اسے خریدا ہوا شوہر منظور ہوتا تو اب تک کتنے ہی بوڑھے اور جوان دولت مند لوگوں کے پیغامات آچکے تھے' جنہیں وہ ٹھکرا چکی تھی۔

ان چار برسوں میں اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس پہاڑ جیسے جوان کو اپنا جیون ساتھی نہیں بنانا چاہتی۔ اس کے باوجود اسے روز صبح دیکھتی ہے اور جس روز نہ دیکھے' بے چین ہوجاتی ہے وہ کوئی نادان لڑکی نہیں تھی۔ وہ بچپن سے ذہین تھی۔ شادی کے بعد دور تک پھیلی ہوئی جائیداد اور دولت نے اسے اور زیادہ چالاک بنادیا تھا۔ وہ دنیاوی معاملات بھی سمجھتی تھی اور دل کے معاملات کو بھی خوب پہچانتی تھی۔ دل ہی دل میں اعتراف کرتی تھی کہ وہ شخص دل و دماغ پر چھاگیا ہے۔ وہ کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کسی سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ چاہت کے نام پر چپکے چپکے اس کے اندر جگہ بناتا جارہا تھا اور وہ تمام تر ذہانت اور چالاکیوں کے باوجود اسے اپنے اندر جگہ بنانے کا خود ہی موقع دے رہی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اسے روز صبح نہ دیکھتی۔

وہ دروازے کی آڑ سے اسے دیکھ رہی تھی اور پریشان ہو رہی تھی۔ وہ پچھلے چار برسوں سے اس کے اندر چھپ چھپ کر آرہا تھا کوئی بات نہ تھی لیکن یہ تو ڈرائنگ روم

تک پہنچ گیا تھا' انگلی پکڑتے پکڑتے پہنچا پکڑ رہا تھا۔

ملازمہ ایک چھوٹی سی بالٹی میں دودھ لاکر اس کے سامنے رکھنے کے بعد کہہ رہی تھی۔ "بس اتنا ہی دودھ گھر میں ہے' اچھا گرم ہے' تھوڑا سا میٹھا بھی ہے۔ آپ نوش فرمائیں۔ حکم ہو تو میں کوئی بڑا سا کانچ کا پیالہ لے آؤں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے' میں دودھ نہیں پیوں گا۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ بیگم صاحبہ سے ملنے والے چائے پیتے ہیں۔ ٹھنڈی بوتلیں پیتے ہیں۔ ان کے ساتھ کھاتے پیتے بھی ہیں۔ آپ ایسے ہی کیسے واپس جاسکتے ہیں۔ آپ کو کچھ نہ کچھ تو پینا ہی ہوگا۔ لہٰذا یہ حاضر ہے۔"

خالدہ نے ڈرائنگ روم میں آتے ہوئے کہا۔ "مسٹر سرور' ابھی ایس پی صاحب کا فون آیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے' انہیں یہاں آنے میں ذرا دیر ہوگی۔ آپ یہاں انتظار کریں۔"

وہ اٹھ کر بولا۔ "پھر میں جاتا ہوں۔ ایک آدھ گھنٹے بعد آجاؤں گا۔"

"ان کے دیر سے آنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم چلے جاؤ۔ انہوں نے میرا پتا کچھ سوچ سمجھ کر ہی دیا تھا......... میں تم سے کچھ ضروری باتیں کروں گی۔"

وہ بیٹھ گیا۔ خالدہ نے کہا۔ "تمہارے دودھ پینے کی عمر نہیں ہے پھر بھی یہ سامنے رکھا ہوا ہے۔ نوش کرو۔"

وہ جھینپتے ہوئے بولا۔ "میں کسی کے ہاں جاکر کھانے پینے سے گریز کرتا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ میں مہذب لوگوں کے سامنے کھانے کی میز پر نہیں بیٹھ سکتا۔"

"کیا تم مہذب نہیں ہو؟"

لیکن کھانے پینے کے معاملے میں دوسروں کے لئے عجوبہ بن جاتا ہوں۔"

"میں سمجھ رہی ہوں' تمہیں عجوبہ نہیں سمجھوں گی۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے بالٹی اٹھائی اور منہ سے لگا کر غٹاغٹ پینے لگا۔ وہ دو سیر دودھ تھا۔ خالدہ کا خیال تھا' وہ سانس لینے کے لئے رکے گا لیکن اس نے ایک ہی سانس میں بالٹی خالی کردی۔ اسے منہ سے الگ کرنے کے بعد سانس لی۔ اس کے ساتھ ہی خالدہ نے بھی ایک گہری سانس لی۔ تب اسے پتا چلا کہ اس کے دودھ پینے کے دوران یہ بھی

نادانستگی میں سانس روکے ہوئے تھی۔ جب اس نے سانس لی تو یہ بھی جلدی جلدی سانس لینے لگی۔ بے اختیار دھڑکتے ہوئے دل سے سوچنے لگی۔ کیا اس کے ہونٹوں سے لگنے والی بالٹی کی سانس بھی رک رک جاتی ہوگی۔

سرور نے پوچھا۔ "کیا دیکھ رہی ہو؟"

وہ چونک گئی۔ اسے پتا ہی نہ چلا کہ وہ کتنی دیر سے ایک ٹک اسے دیکھتی جارہی ہے۔ جلدی سے بولی۔ "سلطان بیگ میرے منہ بولے بھائی ہیں۔ ان کے آجانے پر تم ہمارے ساتھ لنچ کرو گے۔"

"آپ تکلیف نہ کریں۔ میں گھر جاکر کھالوں گا۔"

"کیا تمہیں میرا گھر پسند نہیں ہے؟"

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟ یہ تو بہت ہی شاندار کوٹھی ہے۔ یہ گھر کسے پسند نہیں آئے گا؟"

"تو اس کا مطلب ہوا' میں پسند نہیں ہوں۔"

وہ ذرا سا کسمسایا۔ صوفے پر پہلو بدل کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں......... میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میں کھانے بیٹھوں گا تو تمہارا آدھا کچن خالی ہوجائے گا۔"

"اس کی پروا نہ کرو۔ میں روز تمہارے لئے پورا کچن خالی کرسکتی ہوں۔"

وہ بے اختیار یہ بات کہہ گئی تھی۔ پھر دل ہی دل میں پچھتانے لگی کہ ایسا کیوں کہا۔

سرور نے کہا۔ "معاف کیجئے' میں مفت کھانے کا عادی نہیں ہوں۔ محنت کرتا ہوں اور اپنی کمائی کھاتا ہوں۔"

"یہ تو بڑے فخر کی بات ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی تم میرے ہاں آؤ گے تو میرے ہی کچن سے کھاؤ گے اور اس طرح دوستانہ انداز سے کھانے پینے سے ایک غیرت مند آدمی اپنی نظروں سے کبھی نہیں گرتا۔ بہرحال آج تمہارے لئے کیا پکایا جائے؟"

پہلے تو وہ اعتراض کرتا رہا۔ بہانے کرتا رہا۔ جب خالدہ نے مجبور کیا تو اس نے کہا۔ "میں لنچ میں بکرے کی بھنی ہوئی دو رانیں کھاتا ہوں۔ دس تندوری روٹیاں' دو چار سیر

گوشت کا شوربے والا سالن اور کچھ سلاد وغیرہ کھالیتا ہوں۔"

خالدہ نے فوراً ہی ملازموں کو اس کی فرمائش کے مطابق کھانا پکانے کا حکم دیا۔ جب وہ چلے گئے تو اس نے کہا۔ "بھائی صاحب نے بتایا ہے کہ تم ایک اچھے محب وطن اور ذمے دار شہری ہو۔ بھلا انہیں تم پر کیسے اعتماد ہوگیا؟"

سرور نے اسے بتایا کہ آج صبح اس نے کس طرح گابے جی اور جیلر جبار خان کو ان کی کوٹھی میں پکڑوایا ہے۔ خالدہ نے کہا۔ "تم نے بہت ہی ذمے داری اور فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ عام شہری اتنے بڑے معاملے میں ملوث ہونا پسند نہیں کرتے۔ کیا تمہیں اس بات کا ڈر نہیں تھا کہ بعد میں آئے دن تھانے کچہری کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ اپنے کام چھوڑ کر صرف اسی مقدمے کا ہو کر رہنا پڑتا ہے۔ آمدنی ماری جاتی ہے۔ بیوی بچے پریشان ہوتے ہیں۔ پولیس اسٹیشن اور عدالت میں گھنٹوں ایک مجرم کی طرح بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔"

"میں اس سے بھی زیادہ جانتا ہوں۔ ہم کسی مجرم کو پکڑتے ہیں اور اگر وہ پولیس والوں کا رشتے دار ہوا' دوست یا شناسا ہوا یا وہ مجرم نوٹ چھاپنے کی مشین ثابت ہوا تو اس مجرم کو پکڑوانے والے کی شامت آجاتی ہے۔ الٹا اسے کسی الٹے سیدھے کیس میں پھانس لیا جاتا ہے یا پھر تھوڑی بہت رشوت دے کر ٹرخا دیا جاتا ہے۔"

"واقعی تم بہت کچھ جانتے ہو لیکن سوال پیدا ہوتا ہے' ایسا کب تک ہوگا؟ اگر راستے میں روپوں کی تھیلی پڑی ہو یا نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس کوئی پیش کرے اور کوئی ایسی ملازمت ہو جہاں سے ہر روز سینکڑوں ہزاروں روپے کی آمدنی ہوا کرے تو وہ ملازمت کرنے والا کب تک فرشتہ بن کر رہے گا؟ پولیس والے بھی انسان ہیں۔ ہم انسانوں کی خواہشات کا کوئی اختتام نہیں ہے۔ کوئی انتہا نہیں ہے۔ اپنی.......... خواہشات کی تکمیل کے لئے' دوسروں سے برتر نظر آنے کے لئے ایک چھوٹے مکان کی جگہ بڑا مکان اور بڑے مکان کی جگہ بڑی کوٹھی بنانے کے لئے' موٹر سائیکل چھوڑ کر قیمتی کار حاصل کرنے کے لئے ہم اپنی آمدنی سے زیادہ کمانا چاہتے ہیں۔ جہاں اپنی آمدنی سے زیادہ کمائی شروع ہوتی ہے' وہیں سے جرائم شروع ہوتے ہیں۔ اس اندھیر نگری کے سرکاری اور غیر سرکاری شعبے میں جرائم پھل پھول رہے ہیں۔ پولیس کا نام زیادہ اسی لئے آتا ہے

کہ یہ جرائم کی روک تھام کے لئے ہے لیکن یہاں سے جرائم کو ترغیب اور شہہ بھی ملتی جاتی ہے۔"

خالدہ بول رہی تھی اور سرور اس کا منہ تک رہا تھا۔ پہلوانوں کی عادت ہوتی ہے اور اصول بھی ہوتا ہے کہ جوانی کی ابتدا میں پہلوانی سیکھنے کے دوران عورتوں سے دور رہتے ہیں۔ سرور بھی عورتوں سے کتراتا تھا۔ خاندان کی کسی لڑکی سے کوئی بات ہوتی تو نظریں جھکا کر بات کرتا۔ مختصر سا جواب دیتا اور پھر منہ پھیر کر چلا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج تک اس پر کسی کا جادو نہ چل سکا لیکن آج وہ بڑی دیر سے بے خیالی میں خالدہ کو دیکھتا جارہا تھا۔ دل کہتا تھا' یہ عورت بہت اچھی ہے' تعلیم یافتہ ہے اور جو بات بھی کہہ رہی ہے' ٹھوس دلائل کے ساتھ کہہ رہی ہے۔

اُدھر وہ بھی اس کے چہرے پر نظریں جمائے بولتی جارہی تھی پھر اسے بھی احساس ہوا تو اس نے چونک کر سرور کو دیکھا۔ سرور کو پتا ہی نہ چلا کہ سامنے والی نامعلوم طلسم سے نکل آئی ہے۔ اس نے پوچھا۔ "تم میری بات سن رہے ہو یا کچھ سوچ رہے ہو؟"

اس نے چونک کر کہا۔ "ہاں' ہاں میں سن رہا ہوں۔ تم بہت اچھی باتیں کر رہی ہو۔"

"ہم سب اچھی باتیں کرتے ہیں اور جرائم کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن ان جرائم کا خاتمہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اگر ہم پولیس والوں پر تکیہ کرلیں تو اس اندھیر نگری کا اندھیرا اور بڑھتا چلا جائے گا۔"

"بے شک' ہمیں صرف پولیس والوں پر تکیہ نہیں کرنا چاہئے۔ قانون کا احترام کرنا اور اس کی بالادستی قائم رکھنا ہم شہریوں کا بھی فرض ہے' اس لئے میں نے ان دو ملزموں کو گرفتار کرایا ہے۔"

"جنہیں تم نے گرفتار کرایا ہے' وہ چھوٹ جائیں گے یا اب تک چھوٹ چکے ہوں گے۔"

"انہیں کسی طور پر رہائی نہیں ملے گی۔ تم نہیں جانتیں' ان دو ملزموں کے معاملے میں خود عالی جناب وہاں تشریف لائے تھے۔"

وہ بولی۔ "پچھلے ماہ ڈرگ مافیا کے دہشت گردوں نے ایک علاقے میں خون کی ہولی

کھیلی تھی۔ سینکڑوں افراد کو ہلاک کیا.......... کتنے ہی گھروں کو آگ لگائی۔ وہاں عالی جناب
نہیں گئے۔ ان دو ملزموں کے معاملے میں کیوں چلے آئے۔ یقیناً سابق پولیس آفیسر گابے
جی کا تعلق ڈرگ مافیا سے ہے۔ عالی جناب خود اس کوٹھی میں یہ دیکھنے آئے تھے کہ بات
کتنی بڑھی ہے اور کس حد تک دبائی جاسکتی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے بھائی
صاحب نے بتایا ہے کہ یہ بات دبائی جارہی ہے۔"

سرور نے پوچھا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ عالی جناب کا تعلق بھی ڈرگ مافیا سے
ہے؟"

"میں یہ نہیں کہہ سکتی۔ وہ ایک عرصے سے اہم ذمے دار عہدے پر ہیں۔ ان کی
ایک ذرا سی غلطی سے پورے پولیس ڈپارٹمنٹ کی عزت خاک میں مل سکتی ہے۔ ایسے
اعلیٰ عہدے دار اور حاکم وقت بڑے آزمائشی مرحلوں سے گزرتے ہیں۔ ڈرگ مافیا کی
طرف سے دھمکیاں ملتی ہیں کہ ہمارے آدمی کو گرفتار نہ کیا جائے۔ اگر عوام کی تسلی کے
لئے گرفتار کرنا ضروری ہے تو ان پر جیل میں سختیاں نہ کی جائیں۔ انہیں وی آئی پی
ٹریٹمنٹ دیا جائے اور ان کے مقدمے کو طول دے کر آہستہ آہستہ ختم کردیا جائے۔ اگر
ایسا نہ کیا گیا تو شہر شہر دہشت گردی میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ بات زیادہ بڑھے گی تو اہم
تنصیبات کو ختم کیا جائے گا۔ اب عالی جناب جیسے ذمے دار افسران یہ سوچتے ہیں کہ
دہشت گردی کے نتیجے میں نہ جانے کتنے بے گناہ شہریوں کی جانیں جائیں گی۔ اگر وہ ان
کے کسی خاص شہری کے ساتھ رعایت برتنے کی اجازت دے دیں تو کتنے ہی بے گناہ
شہریوں کی جان و مال کے تحفظ کی ضمانت مل جائے گی۔"

"یہ بات اتنی گھما پھرا کر کہنے کی کیا ضرورت ہے سیدھی طرح کہہ دو کہ اس نگری
کا قانون ڈرگ مافیا کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔"

"اگر قانون کے گھٹنے ٹیکنے سے ہمیں شرم آتی ہے تو ہمیں ایسا راستہ اختیار کرنا
چاہئے جس پر چل کر ہم قانون کو دوبارہ محترم بنا سکیں پھر ہمارے اعلیٰ حکام کو ایسی حکمت
عملی نہ اختیار کرنی پڑے جس سے شہریوں کا تحفظ تو ہوتا ہے لیکن مجرموں کی زیادہ حوصلہ
افزائی ہوتی ہے۔"

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ خالدہ نے پوچھا۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟"

اس نے کہا۔ "آج میں جوڈو کراٹے کا ماسٹر ہوں۔ دو انچ کے موٹے تختے کو کھڑی
ہتھیلی سے توڑ دیتا ہوں۔ جب پندرہ برس کی عمر میں دیسی پہلوانی شروع کی تو میرے استاد
نے سمجھایا۔ عورت کی طرف کبھی نہ دیکھنا۔ اس سے زیادہ نہ بولنا۔ وہ جہاں بیٹھی ہو وہاں
نہ جانا اور جہاں تم بیٹھے ہو اور وہ آجائے تو اپنی جگہ سے اٹھ کر چلے جانا کیوں کہ عورت کم
عقل ہوتی ہے۔ اپنی نادانی سے مرد کو لے ڈوبتی ہے۔"

خالدہ نے کہا۔ "اچھا تو تم مجھے دشمن نظروں سے دیکھ رہے ہو اور سوچ رہے ہو کہ
میں تمہیں ڈبونے والی ہوں۔"

"میں نے آج تک کسی عورت کو دوست کی نظروں سے نہیں دیکھا۔ دشمن کی
نظروں سے تمہیں کیسے دیکھ سکتا ہوں' تم نے تو میرے خیالات بدل دیئے۔ میرے استاد
کی باتوں کو غلط ثابت کردیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عورت تمہارے جیسی بھی ہوتی
ہے اور اتنی دانشمندانہ گفتگو کرتی ہے۔ میرا اپنا ذاتی تجربہ کوئی نہیں ہے مگر میں نے کتابوں
میں پڑھا ہے کہ حسین عورت صرف عشق کرنے کے لئے ہوتی ہے مگر تم اس کے برعکس
ہو۔"

خالدہ نے کہا۔ "شکریہ۔ اس طرح تم یہ بات کہہ گئے ہو کہ میں صرف دانشمند
نہیں' حسین بھی ہوں۔ آج میں آئینہ ضرور دیکھوں گی۔"

وہ جھینپنے لگا۔ وہ بولی۔ "کیا تم میری کوٹھی کو اندر سے دیکھنا پسند کرو گے۔ چلو میں
ایک ایک کمرا' ایک ایک چیز دکھاؤں گی۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں ضرور دیکھوں گا لیکن
شاید تمہاری بات ادھوری رہ گئی یا شاید میں ہی نہ سمجھ سکا کہ ایسا کون سا راستہ اختیار کرنا
چاہئے جس پر چل کر ہمارے قانون کو مجرموں کے سامنے جھکنا نہ پڑے۔"

وہ سرور کے ساتھ ڈرائنگ روم سے نکل کر کوٹھی کے مختلف حصوں کی طرف
جاتے ہوئے بولی۔ "دراصل تم بیٹھے بیٹھے اکتا جاتے ہو' اس لئے میں نے چلتے پھرتے
رہنے کا یہ بہانہ ڈھونڈ لیا ہے۔ میری کوٹھی بھی دیکھتے رہو گے اور ہم باتیں بھی کرتے
رہیں گے۔ میری بات کا جواب یہ ہے کہ شیطانی قوتوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے تین
چیزوں کا یکجا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ایک ذہانت' دوسری قوت' تیسری دولت' میرے پاس

بے حساب دولت ہے۔ میری طرح کم از کم ایک درجن ایسے صاحب دل سرمایہ دار ہیں جو اس اندھیر نگری سے دہشت گردی اور لاقانونیت کو مٹانے کے لئے اپنی دولت کا ایک ایک پیسہ خرچ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہم دولت مند چاہتے ہیں' ہمارا کاروبار سلامت رہے۔ کاروبار پھلتا پھولتا رہے گا تو معیشت مضبوط ہوگی۔ ملک کی اقتصادی حالت بہتر سے بہتر ہوتی جائے گی۔ لوگ خوشحال ہوں گے اور ہم سرمایہ داروں کا بھی فائدہ ہے' ہماری آمدنی بڑھتی بھی رہے گی اور محفوظ بھی رہے گی۔"

وہ ایک کمرے میں آکر رک گئے۔ اس بڑے سے کمرے میں ہر طرف کھلونے ہی کھلونے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اتنے خوبصورت' اتنے قیمتی اور اتنے دلچسپ تھے کہ بڑوں کا دل بھی ان سے کھیلنے کو چاہتا تھا۔ انہیں بڑے سلیقے سے کمرے میں سجا کر رکھا گیا تھا۔ سرور پوچھنا چاہتا تھا' کیا اس گھر میں کوئی بچہ بھی ہے لیکن وہ خالدہ کو دیکھ کر چپ ہوگیا۔ اس کے حسین چہرے پر عجب سانور جھلک رہا تھا۔ وہ نہایت ہی جذباتی ہو کر ایک ایک کھلونے کی طرف گھوم گھوم کر دیکھ رہی تھی۔ فرش پر کچھ کھلونے بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے ایک ایک کھلونے کو سلیقے سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہ ہمارا بلو بہت شریر ہے۔ میں ترتیب سے رکھتی ہوں' وہ آکر اٹھاتا ہے' کھیلتا ہے پھر یونہی فرش پر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔"

سرور نے پوچھا۔ "یہ بلو کون ہے؟"

"آں؟" اس نے خیالات سے چونک کر سرور کو دیکھا پھر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کھلونے کو سینے سے لگا کر بولی۔ "میرا بیٹا ہے۔"

وہ حیرانی سے بولا۔ "کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟ تمہارا ایک بیٹا بھی ہے مگر......... مگر........."

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ خالدہ نے کہا۔ "میں شادی شدہ نہیں لگتی؟ حالانکہ تین برس تک سہاگن رہ چکی ہوں۔ اب عمر بھر کی بیوگی ہے۔"

"تمہارا بیٹا کہاں ہے؟"

اس نے یکبارگی چونک کر سینے سے لگے ہوئے کھلونے کو دور ہٹا دیا۔ کہنے لگی۔

"بچوں کو سینے سے نہیں لگانا چاہئے' کبھی نہیں لگانا چاہئے۔"

"لیکن مائیں تو اپنے بچے کو سینے سے ضرور لگاتی ہیں۔"

"یہی غلطی کرتی ہیں' مجھے راستے میں' گلیوں میں' بازاروں میں' محفلوں میں جہاں بھی کوئی ماں ملتی ہے تو میں اس سے کہتی ہوں' دستور بدل دو۔ اپنے لاڈلوں کو سینے سے لگا کر چومنا چھوڑ دو۔ تم اپنے بچوں کو گود میں اٹھائے' سینے سے لگا کر چلتی ہو' سامنے سے کوئی بھی دہشت گرد گولیاں برساتا ہوا گزرتا ہے۔ وہ سینے سے لگا ہوا بچہ تمہارے لئے ڈھال بن جاتا ہے۔ خود گولی کھاتا ہے' تم لوگوں کو بچالیتا ہے۔"

خالدہ کی آواز میں بلا کا درد تھا۔ لہجے میں ایسا کرب تھا جیسے وہ ممتا کے کربلا میں ننھے سے خون آلود بچے کی لاش اٹھائے کھڑی ہو۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور وہ آنسوؤں کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ سرور سے نظریں چرا رہی تھی۔ کبھی کھلونوں کو اِدھر سے اُدھر رکھ رہی تھی......... پھر اس نے تڑپ کر سرور کو دیکھا پھر پوچھا۔ "کیا تم نے آج تک کسی دو برس کے ننھے کو دیکھا ہے جس نے ڈھال بن کر اپنی ماں کو گولیوں کی بوچھاڑ سے بچایا ہو؟"

وہ کہہ رہی تھی اور سرور تصور کی دھند میں دیکھ رہا تھا۔ وہ دو برس کے بلو کو سینے سے لگائے کھڑی ہوئی تھی اور ایک جیپ میں بیٹھے ہوئے دہشت گرد فائرنگ کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ بچہ لہو میں بھیگ رہا تھا۔ ماں سکتے کے عالم میں کھڑی رہ گئی تھی کیونکہ نہ تو اب بچے کو بچا سکتی تھی' نہ بھاگ سکتی تھی' نہ فریاد کر سکتی تھی۔ لہو میں ڈوبے ہوئے ننھے سے جسم کو اپنے سینے سے لگائے اس خوش فہمی میں تھی کہ ماں کی دھڑکنوں سے لگے ہوئے بچے کا دل پھر دھڑکنے لگے گا۔ وہ پھر اسے آواز دے گا۔ امی' امی' امی۔

سرور نے خیالات سے چونک کر دیکھا۔ وہ ایک ایک کھلونے کو فرش پر رکھ رہی تھی۔ ان کے بٹن آن کر رہی تھی اور وہ سیل سے چلنے والے کھلونے اِدھر سے اُدھر بھاگتے دوڑتے جا رہے تھے۔ پھر وہ سر جھکا کر بولی۔ "یہاں سے چلو میں بعد میں آکر انہیں ترتیب سے رکھ لوں گی۔ بلو کی تو عادت ہے' کھیلتے کھیلتے انہیں فرش پر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔"

وہ کھلونوں کی جنت سے باہر آگئی۔ سرور کو اتنا حوصلہ نہ ہوا کہ وہ پوچھتا کہ بلو کہاں چلا جاتا ہے یا وہ کہاں جا چکا ہے؟

ایس پی سلطان بیگ دوپہر تک آیا۔ کھانا میز پر لگایا جارہا تھا۔ بڑی بڑی چینی کی پلیٹوں پر بکرے کی دو بھنی ہوئی رانیں رکھی ہوئی تھیں۔ کھانے کے لئے اور بھی بہت کچھ تھا۔ سرور نے سلطان بیگ کے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔ "وہ دونوں ملزم حوالات میں ہیں یا جیل میں؟"

سلطان بیگ نے اس پر ایک نظرڈالی پھر کہا۔ "تم بہت شہ زور ہو مگر بھولے ہو۔"

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان لوگوں کو سزا نہیں ہوگی؟"

"یہی سوال میں تم سے کرتا ہوں۔ اگر انہیں سزا نہ ہو اور بات دبادی جائے تو تم کیا کرسکو گے؟"

"میں عالی جناب سے ملوں گا۔ اگر انہوں نے میری بات نہیں سنی اور انہیں سزا نہیں دی تو میں اخباروں میں ان کے خلاف لکھوں گا۔"

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ سابق پولیس آفیسر گابے جی جیل سے باہر آکر کسی کوٹھی میں رات گزار رہا تھا اور اس کے ساتھ جیلر جبار بھی تھا۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں! آپ کے سامنے ہم تینوں کے بیانات لئے گئے۔ ہم سے دستخط لئے گئے۔ عالی جناب نے بھی دستخط کئے۔ اس کی پوری فائل تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے۔"

"وہ فائل تیار ہوچکی ہے۔ چار بجے تک ان ملزموں کے ساتھ ہماری تصویریں آئیں گی۔ اس کے بعد وہ فائل مکمل ہوجائے گی۔ عالی جناب نے بڑی رازداری سے حکم دیا ہے کہ شام پانچ بجے دو شخص میرے دفتر میں آئیں گے اور وہ فائل لے جائیں گے۔"

"وہ کہاں لے جائیں گے؟ وہ کون لوگ ہوں گے؟"

سلطان بیگ نے کہا۔ "یہ ہمیں نہیں بتایا جاتا لیکن میں اپنے خفیہ ذرائع سے معلوم کرلیتا ہوں۔ ان دو میں سے ایک عالی جناب کا خاص آدمی ہوگا اور دوسرا ڈرگ مافیا کا کوئی اہم رکن ہوگا۔ وہ دونوں مجھ سے فائل لے جائیں گے اور کہیں لے جاکر اپنے سامنے جلا ڈالیں گے۔ عالی جناب کو اپنے خاص آدمی کے ذریعے جب اس کے ضائع ہونے کی رپورٹ ملے گی تو اطمینان ہوگا کہ ان کے دستخط بھی اس کیس کے ساتھ جل گئے ہیں اور ڈرگ مافیا والوں کو بھی یقین ہوجائے گا کہ ان کے خاص آدمی گابے جی کے خلاف جو

فائل تیار ہوگئی تھی' وہ ان کے اہم رکن کے سامنے ضائع ہوگئی ہے۔"

سرور شکست خوردہ سا ہوکر سلطان بیگ کا منہ تک رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ آؤ کھانا تیار ہے۔ کھاتے بھی جاؤ اور سوچتے بھی جاؤ کہ ایسا کب تک ہوتا رہے گا اور اگر ایسا ہورہا ہے اور تمہاری محنت ضائع گئی ہے تو اس دھاندلی کو کس طرح روک سکتے ہو۔"

سرور نے میز کے پاس کھڑے ہوکر دونوں ہاتھوں سے ایک پوری ران اٹھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے غصے میں زیادہ بھوک لگتی ہے۔"

اس نے ران کے ایک حصے کو دانتوں سے دبایا پھر ایک بڑی سی بوٹی نوچ کر چباتے ہوئے کہا۔ "میں قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے والوں کا کچا گوشت بھی چبا سکتا ہوں۔"

خالدہ نے کہا۔ "یہ اچھی بات ہے۔ اگر تمہیں یہ معلوم ہوجائے کہ وہ دو شخص اس فائل کو لے کر کہاں جائیں گے تو کیا تم وہ فائل ان سے چھین کر لاسکتے ہو؟"

اس نے ایک ہاتھ سے مسلّم ران کو فضا میں بلند کیا' جیسے پرچم بلند کررہا ہو' پھر ایک گھونسا میز پر مارتے ہوئے کہا۔ "ضرور لاؤں گا۔ مجھے بتاؤ' وہ کون لوگ ہیں اور فائل کہاں لے جائیں گے؟"

سلطان بیگ اور خالدہ نے ایک دوسرے کو کچھ سوالیہ نظروں سے کچھ معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ پھر سلطان بیگ نے کہا۔ "تمہیں ضرور بتایا جائے گا لیکن پہلے ہم تم پر پوری طرح بھروسہ کرنا چاہتے ہیں۔"

"بھروسے کی کیا بات ہے۔ آپ کس طرح بھروسہ کرنا چاہتے ہیں؟ آپ مجھ پر کس طرح کا شبہ کررہے ہیں؟"

"فی الحال تو کوئی شبہ نہیں ہے بلکہ ہمیں یقین ہے کہ تم بہت ہی سچے اور زبان کے پکے ہو۔ تم پہلوانی کرکے صرف اپنا جسم اور جان ہی نہیں بنانا چاہتے بلکہ اپنی قوم کو بھی صحت مند دیکھنا چاہتے ہو۔ یہاں سے ہر برائی' ہر تخریب کاری کو مٹا دینا چاہتے ہو۔"

"جب میں ہر طرح سے آپ کے معیار اور مزاج کے مطابق ہوں تو پھر آپ مجھ سے کیا چھپا رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں، تم بہت قابل ہو۔ ہم تمہیں اور قابل بنانا چاہتے ہیں۔ شاید تم نے ان ملزموں کے سامنے کہا تھا کہ دو انچ کا موٹا تختہ کھڑی ہتھیلی سے توڑ دیتے ہو۔ یقیناً خطرناک فائٹر ہو۔ یہ بتاؤ کیا ہتھیار استعمال کرسکتے ہو؟"

"میں خالی ہاتھوں سے کسی کی بھی گردن توڑ سکتا ہوں میں نے کبھی ہتھیاروں کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"یہ زمانہ خطرناک ہتھیاروں کا ہے۔ پہلے تم انہیں استعمال کرنا سیکھو گے۔ ہمارے آدمی تمہیں ہر طرح کے ہتھیاروں کو استعمال کرنا سکھائیں گے۔ جب تم صحیح نشانہ لگانے میں مہارت حاصل کرلو گے تو پھر تمہیں وہ راستہ بتایا جائے گا جس پر قدم رکھو گے تو قانون کے پاؤں مضبوط ہوں گے اور ڈرگ مافیا کے قدم اکھڑ جائیں گے۔"

"لیکن میں یہ کب تک سیکھ پاؤں گا؟ اس وقت تک ان دو ملزموں کا کیا بنے گا؟ وہ فائل تو آج ہی ضائع کردی جائے گی۔"

"سرور، تم نے نہایت ذمے داری کے ساتھ ایک شہری کا فرض انجام دیا ہے اور ان ملزموں کو گرفتار کرایا ہے۔ میں تمہاری یہ محنت رائیگاں نہیں جانے دوں گا۔ وہ دو آدمی شام کو دفتر آکر مجھ سے فائل لے جائیں گے لیکن وہ زیادہ دور نہیں جاسکیں گے۔ موت ان کی تاک میں ہوگی اور وہ فائل خفیہ طور سے پھر میرے پاس پہنچ جائے گی۔"

سرور نے خوش ہوکر کہا۔ "یہ تو میرے دل کی بات ہے۔ میں ایسے لوگوں کی گردن توڑ کر وہ فائل لانا چاہتا ہوں اور یہ کام آپ کرنا چاہتے ہیں یا کسی سے کرانا چاہتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ابھی میں آپ لوگوں کے معیار کے مطابق نہیں ہوں لیکن جلدی ہی خود کو اس قابل بنا کر دکھاؤں گا۔"

خالدہ نے کہا۔ "میں نے تم سے کہا تھا، تین چیزوں کی ضرورت ہے، دولت کے متعلق میں نے تمہیں بتا دیا۔ ذہانت میرے بھائی سلطان بیگ کی ہے۔ ان کے سات مشیر ہیں جو ان کی طرح نہایت ذہین اور بہترین پلان میکر ہیں۔ تیسری قوت ہے جو تمہارے جیسے صحت مند لوگوں کے ذریعے ہمیں حاصل ہوتی ہے۔ تم غیر معمولی قد اور جسامت کے مالک ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ صرف تمہارے جیسا آدمی ہی شہ زور ہوتا ہے۔ ہمارے پاس ایسے دلیر اور حوصلہ مند لوگ ہیں جو بہترین فائٹر ہیں اور پکے نشانہ باز ہیں۔ جب وہ

کسی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہیں تو آندھی طوفان کی طرح گولیوں کی بوچھاڑ سے گزرتے ہیں۔ وہ صرف دھماکے کرنا نہیں جانتے، ٹائم بم بنانا اور بارودی سرنگیں بچھانا بھی جانتے ہیں۔ ان کی سب سے قابلِ ذکر جوانمردی یہ ہے کہ ہمارا کوئی آدمی دشمن کی گرفت میں آجائے تو اس کی طرف سے ملنے والی اذیتوں کو برداشت کرتے کرتے مرجاتا ہے لیکن اپنا نام اور پتا کبھی نہیں بتاتا۔"

وہ بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہا تھا اور خالدہ کو دیکھتا جارہا تھا۔ سوچتا جارہا تھا، یہ باتوں سے بالکل نارمل لگتی ہے لیکن بچے کے بارے میں بہکی بہکی باتیں کررہی تھی، وہ دونوں اپنا کھیل ختم کرچکے تھے۔ اب سرور کو کھاتے دیکھ رہے تھے۔ وہ بولی۔ "میری دلی خواہش ہے کہ تم بھی میرے آدمیوں جیسی صلاحیتیں حاصل کرلو لیکن میری خواہش سے کیا ہوتا ہے۔ جب تک تمہارے اندر تحریک پیدا نہ ہو، اس وقت تک تم پوری توجہ اور مستعدی سے کچھ نہیں سیکھ سکو گے۔"

وہ دو رانوں کی بوٹیاں نوچ کر کھا چکا تھا۔ اب صرف ہڈیاں رہ گئی تھی۔ اب وہ ہڈیاں چبا رہا تھا اور کہہ رہا تھا "میں سیکھ لوں گا۔ تم نے مجھ میں تحریک پیدا کردی ہے۔"

وہ خوش ہوکر بولی۔ "کیا میں نے ایسا کیا ہے؟"

"ہاں، میں نے بلو کو اپنے اندر تمہارے لہجے میں روتے ہوئے سنا ہے میں ہر اس بچے کی حفاظت کروں گا جو اپنی ماں کے سینے سے لگا ہوا ہے۔"

خالدہ کا چہرہ اچانک ہی ممتا کی حرارت سے تمتمانے لگا لیکن ممتا کے علاوہ کوئی اور بھی جذبہ تھا۔ اس نے پہلی بار سرور کو اپنے سامنے محسوس کیا۔ پھر بڑی آہستگی سے دوپٹے کا آنچل اپنے سر پر رکھ لیا۔

☆------☆------☆

عالی جناب اپنی شاندار کوٹھی کے شاندار بیڈ روم میں بڑی بے چینی سے ٹہل رہے
تھے۔ وہ جتنے خوشحال تھے اتنی ہی پریشان بھی تھے۔ وہ پولیس ڈپارٹمنٹ کے حاکمِ اعلیٰ
تھے۔ ان کی کوٹھی کے اطراف مسلح سپاہیوں کا پہرہ رہتا تھا جب وہ باہر نکلتے تو ان کے ساتھ
مسلح گارڈز ہوتے تھے۔ اس کے باوجود وہ خود کو غیر محفوظ سمجھ رہے تھے۔ ان کے سامنے
ایک آرام دہ صوفے پر ڈرگ مافیا کا مارشل ایجنٹ بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے ٹہلتے ٹہلتے رک
کر اسے غصے سے دیکھا پھر کہا۔ "تم نے مجھے گھر کا رکھا ہے نہ گھاٹ کا نہ میں اپنے ملک کا
وفادار رہا......... اور نہ ہی تمہاری وفاداری کر کے اپنی جان بچا سکتا ہوں۔ ویسے مجھے اپنی
جان کی زیادہ پروا نہیں ہے لیکن اس اعلیٰ عہدے پر رہ کر مجھے جو عزت مل رہی ہے' اس
عزت کے حوالے سے میری آئندہ نسل کو جو عزت اور مان مرتبہ ملنے والا ہے' وہ سب
خاک میں مل کر رہ جائے گا۔"

مارشل ایجنٹ نے کہا۔ "ہم خود حیران و پریشان ہیں۔ آخر یہ کون لوگ ہیں جو
ہماری کمزوریاں اپنے ہاتھوں میں لے رہے ہیں اور ہمیں بلیک میل کر رہے ہیں۔"

عالی جناب نے کہا۔ "ہماری کمزوریاں نہیں' صرف میری کمزوریاں اپنے ہاتھوں میں
لے رہے ہیں' تمہارا کیا بگڑے گا۔ تم تو ایک خفیہ تنظیم کے ایجنٹ ہو۔ میں تمہیں غصے
سے گولی مار دوں گا یا تم انجانے دشمنوں کی گولی کا نشانہ بن جاؤ گے تو تمہاری جگہ کوئی
دوسرا مارشل ایجنٹ آجائے گا۔ تم ایک گمنام شخص ہو۔ تم زندہ رہو یا مردہ ہو جاؤ' تمہاری
کوئی بدنامی نہیں ہوگی لیکن میں اس نگری' سے تعلق رکھتا ہوں۔ یہ میرے باپ دادا کی
زمین ہے اور آئندہ میرے جوان بچے یہاں عزت اور وقار سے رہنا چاہیں گے لیکن جب
مجھ پر مقدمہ چلے گا تو مجھے سزا ہوگی۔ سزا جیسی بھی ہو لیکن اس سزا کا اثر میری آئندہ
نسلوں پر ہوگا۔ میرے جوان بچے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

"عالی جناب' تم اپنا دکھڑا کیوں سناتے ہو۔ ہمارے درمیان جو سمجھوتہ ہو گیا ہے' ہم
اس کے مطابق کام کرتے ہیں۔ ہم تمہیں اتنی دولت دیتے ہیں جس کی تم پہلے کبھی توقع
نہیں کرتے تھے اور ہم تمہاری جان و مال کی حفاظت کا یقین دلاتے ہیں۔ تمہاری بڑی بڑی
رقمیں بیرون ممالک کے بینکوں میں ہیں۔ اس سے پہلے کہ تمہارے ملک کا قانون تمہیں
اپنی گرفت میں لے' ہم یہاں سے تمہیں سرحد پار کرا سکتے ہیں۔ رفتہ رفتہ تمہارے بچے
بھی اس ملک سے باہر چلے جائیں گے۔ پھر وہاں اتنی دولت ہوگی کہ تم وہاں اپنی آئندہ
نسل کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرو گے۔"

"تم......... تم مجھے ضمیر فروش اور وطن فروش کہہ رہے ہو۔ بے شک میں تم
لوگوں سے بڑی بڑی رقمیں لے رہا ہوں۔ یہ میری ضرورت ہے میں اپنے جوان بچوں کا
مستقبل بنانا چاہتا ہوں لیکن اپنے ملک اور اپنی قوم کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ یہ بات تم
اچھی طرح جانتے ہو' جب بھی تم سے سمجھوتہ ہوتا ہے تو میں اپنی قوم کے لوگوں کو زیادہ
سے زیادہ......... دہشت گردی سے بچانے' ان کی عورتوں اور بچوں کو' ان کی جان و مال
کو محفوظ رکھنے کے لئے تم سے سودا کرتا ہوں۔ تمہارے آدمیوں کو قانون کی زد میں آنے
سے بچاتا ہوں۔ جو قانون کی گرفت میں آجاتے ہیں ان کی فائل غائب کرا دیتا ہوں جن کی
فائل غائب نہ ہو سکیں' ان کے مقدمات کمزور بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں۔ اگر تم
یہ سمجھتے ہو کہ میں بیرونی ممالک میں دولت جمع کرنے کے لئے اور وہاں جا کر اپنی فیملی کے
ساتھ زندگی گزارنے کے لئے یہ سب کچھ کر رہا ہوں تو تم غلط سمجھ رہے ہو۔ بے شک
میں چاہتا ہوں میرے بچے کسی بڑے ملک کی بڑی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کریں۔ اعلیٰ
ڈگریاں حاصل کریں لیکن میں اور میرے بچے جب بھی باہر جائیں گے تو گھوم پھر کر پھر اپنی
زمین اور اپنے لوگوں کے درمیان آجائیں۔ وہ اپنے لوگ جن کی حفاظت کے لئے میں
تمہاری ہر ناجائز بات مان لیتا ہوں۔"

مارشل ایجنٹ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ تو وہی بات ہوئی۔ رند کے رند رہے' ہاتھ
سے جنت نہ گئی۔ ہماری مہربانیوں سے دولت مند بنتے جا رہے ہو اور محب وطن ہونے کا
دعویٰ بھی کر رہے ہو۔"

"میں محب وطن نہیں ہوں۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں اپنی حکمتِ عملی

سے صرف اپنا ضمیر بیچ رہا ہوں اور اس کے بدلے اپنی زمین پر دہشت گردی کے خطرات کم کرتا جارہا ہوں۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "جو لوگ دوغلی پالیسی اختیار کرتے ہیں وہ تھوڑے اِدھر کے رہتے ہیں' تھوڑے اُدھر کے رہتے ہیں۔ جب انجام سامنے آتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ نہ اِدھر کے رہے تھے نہ اُدھر کے۔ بہرحال ہم نے وعدہ کیا تھا کہ تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ اس خفیہ تنظیم کے لوگوں نے تمہاری دو اہم فائلیں غائب کردی ہیں جس میں تمہارے دستخط بھی ہیں اور میرے خاص آدمیوں کے ساتھ تمہاری تصویریں بھی ہیں۔ میں مانتا ہوں تم اس وقت بہت پریشان ہو اگر وہ فائلیں عوام کی عدالت میں پیش کردی گئیں تو وہی بات ہوگی جو ابھی میں کہہ چکا ہوں۔ یعنی نہ اِدھر کے رہو گے نہ اُدھر کے۔ اب ایک بات بتاؤ کیا فائلیں غائب کرنے والوں نے تمہیں کسی قسم کی دھمکی دی ہے یا کسی کے ذریعے بلیک میل کر رہے ہیں؟"

عالی جناب نے جھنجلا کر کہا۔ "وہ کچھ نہیں کر رہے ہیں' ان کی پُراسرار خاموشی ظاہر کر رہی ہے' کوئی زبردست طوفان اٹھنے والا ہے۔ میں دہشت کے مارے راتوں کو اچھی طرح سو نہیں سکتا۔ اچھی طرح کھا پی نہیں سکتا۔ میرے بیوی بچے کہتے ہیں' میں ایک عرصے سے مسکرانا بھول گیا ہوں۔"

"تم ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سہم گئے ہو۔ بھئی سیدھی سی بات ہے۔ ایسی کوئی بھی خفیہ تنظیم جو دہشت گردی کو اپنا ذریعہ بناتی ہو' سرِعام ہمارے آدمیوں کو گولیاں مار کر فائلیں چھین کر لے جاتی ہو' اس کے نیک مقاصد نہیں ہوں گے۔ ان کے اپنے ضرورت سے زیادہ اخراجات ہوں گے۔ اپنے آدمیوں کی پرورش کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ رقم کی ضرورت ہوگی لہٰذا وہ ابھی تمہارے خلاف ثبوت جمع کر رہے ہیں۔ پھر تمہیں بلیک میل کریں گے تم سے بھاری بھاری رقموں کا مطالبہ کریں گے یا جس طرح بھی تمہیں بلیک میل کریں گے' تم ہمیں بتادینا ہم ان کا ہر مطالبہ پورا کرنے کو ہمہ وقت تیار ہیں۔"

عالی جناب نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر ایسی بات ہوئی تو بہت اچھی بات ہوگی مجھے اطمینان ہوگا لیکن وہ کوئی میرا پرانا دشمن ہوا اور مجھے تباہ کرنے پر بضد رہا تو میں اس کے رحم وکرم پر رہوں گا اور تمہاری طاقت اور دولت کوئی کام نہیں آئے گی۔"

"تم منفی انداز میں سوچتے ہو اس لئے پریشان ہوتے ہو۔ مثبت انداز میں سوچو کہ ہمارے پاس دولت ہے' طاقت ہے' بڑے بڑے ذرائع ہیں۔ تمہیں بلیک میل کرنے والوں کو ہم کسی نہ کسی طرح قابو میں کرلیں گے۔ تم پریشان ہونا چھوڑ دو۔"

"میں نے دو ماہ پہلے انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل سے کہا تھا کہ میری ایک فائل غائب ہوگئی ہے۔ اپنے ذہین ترین سراغ رسانوں کے ذریعے اس خفیہ تنظیم کا پتا چلائیں۔ آخر وہ کون لوگ ہیں اور کس ملک سے تعلق رکھتے ہیں؟ کل جب سابق پولیس آفیسر گابے جی کی فائل غائب ہوئی تو میں نے پھر ڈائریکٹر جنرل سے رابطہ کیا۔ انہوں نے بتایا۔ اگر ان فائلوں کی چوری میں کسی خفیہ تنظیم کا ہاتھ ہے تو وہ لوگ بہت محتاط ہیں۔ اپنے پیچھے کوئی نشان' کوئی نقشِ قدم نہیں چھوڑتے ہیں.......... ویسے انٹیلی جنس کے نوجوانوں سے لے کر بوڑھے خرانٹ جاسوسوں تک سبھی ان کا سراغ لگانے کی کوششوں میں ہیں۔ اس خفیہ تنظیم کے لوگ زیادہ عرصے تک چھپے نہیں رہ سکیں گے۔"

ان کی بات ختم ہوتے ہی ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ پھر خاموش ہوگئی۔ دوسری طرف ان کے سیکرٹری نے ریسیور اٹھا کر معلوم کیا ہوگا کہ کون فون پر بات کرنا چاہتا ہے۔ پھر انٹرکام پر اشارہ موصول ہوا۔ عالی جناب نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر پوچھا تو سیکریٹری نے کہا۔ "انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

انہوں نے انٹرکام کا ریسیور رکھا پھر ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کر کہا۔ "میں عالی جناب بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے ڈائریکٹر جنرل نے کہا۔ "میرے کئی جاسوس اپنے اپنے طریقۂ کار کے مطابق کام کرتے ہیں لیکن اس بار سب کا ایک مشترکہ سوال ہے اور وہ یہ کہ آپ کا.......... ایس پی سلطان بیگ کس قسم کا آدمی ہے۔ اس کا کیریکٹر کیسا ہے' مزاج کیسا ہے اور وہ کس حد تک پولیس ڈپارٹمنٹ سے وفاداری کرتا ہے۔"

عالی جناب نے کہا۔ "میں اس کی وفاداری پر شبہ نہیں کرسکتا کیوں کہ میں جو حکم دیتا ہوں وہ اس پر عمل کرتا ہے' اہم معاملات کی فائلیں مکمل کرکے میرے حکم کے مطابق میرے دفتر روانہ کردیتا ہے۔"

"یہی تو میرے جاسوس کہتے ہیں۔ وہ اہم فائلیں جو چوری کی گئیں یا کرائی گئیں' و

دونوں ایس پی سلطان بیگ کے دفتر سے نکلی تھیں۔ آپ کو' سلطان بیگ کو یا فائل لے جانے والے تیسرے چوتھے شخص کو معلوم تھا کہ فائل کہاں ہے اور کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے۔"

"کیا آپ ایس پی سلطان بیگ پر شبہ کررہے ہیں؟"

"میرے جاسوس تو آپ پر بھی شبہ کرسکتے ہیں۔ اس کے بغیر اصل مجرم تک نہیں پہنچا جاسکتا۔"

"ایسی بات ہے تو آپ سلطان بیگ کے پیچھے جاسوس لگادیں۔"

"آپ کے مشورے سے پہلے ہی ہمارے آدمی اس کی نگرانی کررہے ہیں۔ میں نے محض اس لئے فون کیا ہے کہ میرے چند جاسوس ایس پی سلطان بیگ کا سروس ریکارڈ پڑھنا چاہتے ہیں۔ کل وہ آپ کے دفتر آئیں گے پلیز اس سلسلے میں انہیں سہولتیں فراہم کی جائیں۔ دیٹس آل۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ عالی جناب نے ریسیور رکھا۔ مارشل ایجنٹ نے کہا۔ "میں نے فون پر ہونے والی پوری بات نہیں سنی لیکن اتنا ہی سننا کافی ہے کہ ایس پی سلطان بیگ پر شبہ کیا جارہا ہے تمہارے ملک کے جاسوس اس کا سروس ریکارڈ پڑھنا چاہتے ہیں۔ میں اس کی ہسٹری معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کے متعلق کچھ بتاؤ۔"

عالی جناب نے کہا۔ "وہ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اچھی گھریلو زندگی گزار رہا ہے۔"

مارشل ایجنٹ نے کہا۔ "اس کی گھریلو زندگی کس حد تک خوشحال ہے۔ جتنا کماتا ہے' اس سے زیادہ خرچ کرتا ہے۔ کیا وہ کوٹھیوں اور کاروں کا مالک ہے؟"

"اگر وہ پولیس کی ملازمت نہ کرتا تب بھی کوٹھیوں اور کاروں کا مالک ہوتا۔ کیوں کہ وہ خاندانی رئیس ہے۔"

"خاندانی رئیس ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ آدمی جتنا دولت مند ہوتا ہے اس سے اور زیادہ دولت مند ہونا چاہتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ خاندانی رئیس ہے تو اسے پولیس میں ملازمت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جواب صاف سمجھ میں آتا ہے۔ لوگ اس ڈپارٹمنٹ میں اندھی کمائی کی توقع کرتے ہیں اس لئے چلے آتے ہیں۔"

عالی جناب نے کہا۔ "میں اپنے تمام ماتحت افسران پر کڑی نظر رکھتا ہوں۔ اس ڈپارٹمنٹ میں میرے خاص لوگ موجود ہیں جو مجھے ہر آفیسر کے متعلق رپورٹ دیتے ہیں' سلطان بیگ کے متعلق ہمیشہ یہ رپورٹ رہی کہ اس نے کبھی کسی سے رشوت نہیں لی۔ کبھی کسی کا ناجائز کام نہیں کیا اس نے کبھی کسی شریف آدمی کو تھانے بلاکر پریشان نہیں کیا اور نہ کبھی کسی مجرم کو تھانے کی کسی کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دی۔ اسی لئے میں اس سے کسی غیر قانونی کام کی توقع نہیں کرتا اور نہ ہی اسے اپنا رازدار بناتا ہوں۔"

مارشل ایجنٹ نے پوچھا۔ "جب وہ آپ کا رازدار نہیں ہے تو پھر وہ دو فائلیں جو چوری ہوگئیں' انہیں آپ کے پاس بھیجنے پر کیوں آمادہ ہوگیا؟"

"میں اس ڈپارٹمنٹ کا عالی جناب ہوں۔ میرے حکم سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ اسی لئے وہ بے چون وچرا فائلیں میرے پاس بھیج دیتا ہے۔"

"کیا اس کا امکان نہیں ہے کہ آپ کی تسلی کے لئے فائلیں بھیج دیتا ہے اور پھر اپنے آدمیوں کے ذریعے غائب کرا دیتا ہے؟"

عالی جناب نے کہا۔ "میں اس کے متعلق ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"تمہیں سوچنا چاہئے۔ تمہارے بیان کے مطابق وہ شخص نہایت ہی ایماندار ہے۔ قانون کا احترام کرتا ہے کسی سے رعایت نہیں کرتا تو پھر وہ تمہاری بات کیوں مان لیتا ہے جب کہ اس کے ہاتھ میں آنے والے کیس کی فائل کو وہ خود مکمل کرنے کا مجاز ہے اور خود وہ فائلیں مجرم کے ساتھ عدالت میں پیش کرنے کا حق رکھتا ہے جب کہ آپ اس سے منگواتے ہیں اور وہ آپ کے پاس بھیج دیتا ہے۔ اس لئے کہ آپ اس ڈپارٹمنٹ کے اعلیٰ حاکم ہیں۔ آپ کے حکم سے وہ انکار کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ آپ اس پہلو پر غور کریں کہ وہ وردی میں رہ کر آپ کا تابعدار ہے۔ آپ کے حکم سے انکار کرنے کی جرأت نہیں کرتا لیکن دوسری طرف فائلیں غائب کرنے کی جرأت کرتا رہتا ہے۔"

"مارشل' تم کہتے ہو تو میں اس پر شبہ کروں گا۔"

"بے شک کرنا چاہئے۔ اپنے سائے پر بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔ اب میرے سوالوں کا جواب دو۔ کیا وہ جوا کھیلتا ہے؟"

"نہیں' یہی تو اس کی خوبی ہے۔ اگر وہ جوا کھیلتا' بڑی بڑی رقمیں ہارتا تو دوسری

طرف بڑی بڑی رقمیں رشوت کے طور پر وصول کرتا لیکن وہ ایسا نہیں ہے۔"

"کیا وہ شراب پیتا ہے؟ کیا اسے حسین عورتوں سے دلچسپی ہے؟"

"دونوں میں سے کوئی بات نہیں ہے۔ بیگم خالدہ امانت نامی ایک کروڑ پتی بیوہ ہے۔ بے حد حسین ہے لیکن سلطان بیگ نے اس حسین عورت کو بہن بنایا ہے۔ اس سے اس کی شرافت اور بے داغ کردار کا پتا چلتا ہے۔"

مارشل ایجنٹ خلاء میں تکنے لگا۔ صوفے کے ہتھے کو انگلیوں سے بجاتے ہوئے کچھ سوچنے لگا پھر اس نے کہا۔ "منشیات اور اسلحہ کی فروخت سے جو کثیر آمدنی ہوتی ہے' اس سے خفیہ دہشت گرد تنظیم کے اخراجات پورے کئے جاتے ہیں۔ آج کل کچھ لوگ تھوک کے حساب سے منشیات اور اسلحہ خرید رہے ہیں اور انہیں کہیں اسٹور کر رہے ہیں دوسرے لفظوں میں کہیں چھپا کر رکھ رہے ہیں۔ بازار میں لانے نہیں دیتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خریدنے والے بے انتہا دولت مند ہیں۔ ہم اس اندھیر نگری کو منشیات کی بین الاقوامی مارکیٹ بنانا چاہتے ہیں اور وہ ہمارے مال کو مارکیٹ تک پہنچنے سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

عالی جناب نے پوچھا۔ "آخر وہ کتنا مال خریدیں گے؟ منشیات اور اسلحہ جو ہماری مارکیٹ میں آتا ہے اور بیرونی ممالک بھیجا جاتا ہے' اس کی قیمت اربوں ڈالر تک پہنچتی ہے اس نئی خفیہ تنظیم میں آخر کتنے دولت مند لوگ ہیں جو تمام مال خرید کر اس بازار کو بند کرنا چاہتے ہیں؟"

مارشل ایجنٹ نے کہا۔ "یہی تو بات ہے وہ تمام مال خریدتے نہیں ہیں۔ کچھ خریدتے ہیں اور زیادہ تر اسمگل ہونے والی منشیات اور اسلحہ پر چھاپا مارتے ہیں اور انہیں لوٹ کر لے جاتے ہیں۔"

مارشل ایجنٹ ذرا دیر کے لئے چپ ہوا بے خیالی میں اسی طرح صوفے کے ہتھے پر انگلیاں بجاتا رہا پھر اس نے کہا۔ "اب میرے جاسوس دیکھیں گے کہ سلطان بیگ نے ایک کروڑ پتی بیوہ کو بہن بنایا ہے یا ایک سے زیادہ کروڑ پتی بہنوں اور بھائیوں سے رشتہ جوڑتا جارہا ہے۔ اگر وہ ایسی رشتے داری قائم کررہا ہے تو پھر وہی ہمارا ٹارگٹ ہے۔"

وہ بول رہا تھا خلاء میں تک رہا تھا۔ اس کی انگلیاں صوفے کے ہتھے پر آہستہ آہستہ

بج رہی تھیں جیسے وہ ایک ایک انگلی' ایک ایک قدم چلتا ہوا صحیح ٹارگٹ تک پہنچ رہا ہو۔

☆======☆======☆

خالدہ ایک بڑی سی ویگن ڈرائیو کررہی تھی۔ سرور اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا' کن انکھیوں سے اسے دیکھتا بھی جارہا تھا اور یوں دیکھتے دیکھتے اس کی دنیا بدل رہی تھی۔ مزاج بدل رہا تھا۔ جذبے بدل رہے تھے۔ اس نے دو دن اور دو راتوں تک اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کی کہ خالدہ سے دور رہنا چاہئے لیکن دل نہیں چاہتا تھا اور دماغ سمجھاتا تھا' اگر وطن کی سلامتی اور قوم کی خوشحالی منظور ہے تو خالدہ اور سلطان بیگ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا ہے اور اس راستے پر چلنے کا مطلب یہی تھا کہ وقتاً فوقتاً خالدہ کے قریب رہنا ہے۔

اَب تو ڈھائی سو میل تک اسے ساتھ رہنا تھا۔ سلطان بیگ نے کہا تھا۔ "میں اپنی ڈیوٹی کی وجہ سے مجبور ہوں۔ تمہارے ساتھ نہیں جاسکوں گا لیکن خالدہ تمہیں اس خفیہ کیمپ تک پہنچائے گی جہاں تمہیں ہر طرح کے ہتھیاروں کو استعمال کرنا سکھایا جائے گا۔ اس کے علاوہ بھی تم دشمنوں سے نمٹنے کے لئے اور جو ہنر سیکھنا چاہو گے' تمہیں سکھایا جائے گا۔ ویگن کے پچھلے حصے میں کھانے پینے اور دوسری ضروریات کا بہت سا سامان موجود تھا۔ اس کی چھت پر ایک خیمہ لگانے کا پورا سامان باندھ کر رکھا گیا تھا۔ سرور نے پوچھا۔ "یہ خیمہ کس لئے ہے؟"

خالدہ نے شہر کی حدود سے نکل کر ایک جگہ گاڑی روک دی پھر کہا۔ "ہم سپر ہائی وے سے نہیں جارہے ہیں۔ میں نے یہ دوسرا راستہ اختیار کیا ہے۔ اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے زیادہ وقت لگے گا۔ اب زیادہ فاصلہ ہوگا یعنی ہم کوئی تین سو' سوا تین سو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس کیمپ میں پہنچیں گے۔"

"پھر تو رات ہوجائے گی۔ شاید ہم کل تک وہاں پہنچ سکیں۔"

"اسی لئے تو خیمہ رکھ لیا ہے۔ کوئی مناسب سی جگہ دیکھ کر کیمپ لگائیں گے اور وہاں آرام سے رات گزاریں گے۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا تم تنہا کسی ویران علاقے میں میرے ساتھ رات گزارو گی؟"

"کیا تم کوئی حیوان ہو؟ درندے ہو۔ مجھے چیر پھاڑ کر کھا جاؤ گے۔ اگر ایسی کوئی بات نہیں ہے تو میں کسی ہوس پرست سے کبھی نہیں ڈرتی۔ تم میری عزت کی طرف بڑھو گے تو اس سے پہلے ہی تمہیں ختم کردوں گی۔ میں تمہارے جیسے شہ زوروں کو قابو میں کرنے یا ختم کرنے کے ہتھکنڈے اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"دیکھو' کسی مرد کو اس طرح چیلنج نہ کرو۔ اگر وہ شریف ہے تو چیلنج سن کر شیطان بن جائے گا۔ کیا تمہیں احساس ہے کہ تم نادانستگی میں میری مردانگی کو للکار رہی ہو۔"

"سوری' مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں تمہیں اپنا دشمن نہیں دوست سمجھتی ہوں۔ تمہارے ساتھ کہیں رات گزارنے کے سلسلے میں تمہاری شرافت پر بھروسہ کر رہی ہوں۔ اب سے پہلے میں نے جو کچھ کہا ہے وہ دشمنوں اور شیطان صفت لوگوں کے لئے کہا ہے۔ پلیز' اس بات کو بھول جاؤ۔"

"چلو' بھول گیا۔ پھر بھی میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم اتنا لمبا راستہ کیوں اختیار کر رہی ہو؟"

"اس لئے کہ کل کیمپ میں پہنچتے پہنچتے میں تمہیں ڈرائیونگ سکھا دوں گی۔ تم راستے میں یہ گاڑی ڈرائیو کرتے جاؤ گے اور میں تمہیں گائیڈ کرتی رہوں گی۔"

وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر اتر گئی پھر سامنے سے گھومتی ہوئی اس کی طرف آئی اور دروازہ کھول کر بولی۔ "چلو اترو اور اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھو۔"

وہ جینز اور جیکٹ میں تھی۔ فل بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ پیشانی سے سر کے پیچھے تک ایک سرخ فیتہ بندھا ہوا تھا تاکہ ریشمی زلفیں چہرے پر آکر پریشان نہ کریں۔ جیکٹ کے اندر بغلی ہولسٹر میں ایک ریوالور رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک عورت تھی مگر شیرنی لگ رہی تھی۔

سرور اپنی جگہ سے اٹھ کر گاڑی کے اگلے حصے سے گھومتا ہوا اسٹیرنگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ دونوں طرف کے دروازے بند ہوگئے۔ وہ بتانے لگی۔ "دیکھو ایک پاؤں ایکسیلیٹر پر رکھو۔ ہاتھ گیئر پر اور دوسرے ہاتھ سے چابی گھماؤ۔ میری ہر بات کو توجہ سے سنو اور اس پر توجہ سے عمل کرو۔ سیکھنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ پھر تین سو' سوا تین سو میل تک ڈرائیو کرتے رہو گے تو ڈرائیونگ میں خاصی مہارت حاصل کرلو گے۔"

وہ اس کی ہدایات پر عمل کرنے لگا لیکن کبھی کبھی غلطی ہو جاتی تھی۔ کبھی گیئر بدلتے وقت ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھنا بھول جاتا تھا۔ کبھی رفتار ضرورت سے زیادہ بڑھا دیتا تھا۔ کبھی اچانک ہی بریک لگا دیتا تھا۔

وہ کند ذہن نہیں تھا۔ اسے ایک بات جو سمجھائی جاتی تھی' اسے فوراً سمجھتا تھا اور اس پر کامیابی سے عمل بھی کرتا تھا لیکن یہاں معاملہ کچھ اور تھا۔ وہ سکھانے کے لئے بہت قریب آجاتی تھی۔ اس پہلوان نے تصور میں بھی آج تک کسی عورت کو اتنے قریب نہیں دیکھا تھا۔ خالدہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ رہی تھی۔ اس کے بدن کی آنچ بگاڑ رہی تھی۔ اگر وہ ایک جگہ بیٹھے ہوتے تو کوئی بات نہیں تھی لیکن گاڑی اچانک ہی چلتے چلتے جب اناڑی ڈرائیور کی وجہ سے جھٹکے کھاتی تھی تو دونوں طرف جھٹکے لگتے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔ ٹکرانے کا انجام اکثر برا ہوتا ہے اور کبھی کبھی خوبی قسمت سے برا نہیں ہوتا۔ شیشہ شیشے سے ٹکرائے تو ٹوٹ جاتا ہے۔ پتھر پتھر سے ٹکرائے تو چنگاریاں نکلتی ہیں اور بدن سے بدن ٹکرائے تو پسینہ آتا ہے۔ وہ پسینہ پونچھنے لگا۔ خالدہ نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

وہ اس کی طرف گھوم کر بولا۔ "تم سکھاؤ گی تو زندگی بھر نہیں سیکھ سکوں گا۔"

وہ حیرانی سے بولی۔ "ایسی کیا بات ہے؟"

"کیا تم اتنے قریب آکر کچھ محسوس نہیں کرتی ہو؟"

وہ ایک دم سے پیچھے ہٹ گئی پھر دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر کھڑکی کی طرف گھوم گئی تاکہ وہ چہرے کے تاثرات کو دیکھ نہ سکے۔ وہ بہت سمجھ دار تھی لیکن ایسے وقت ذہانت کام نہیں آتی۔ یہ بھول گئی کہ منہ چھپانے سے بات صاف سمجھ میں آجاتی ہے کہ عورت کچھ چھپا رہی ہے۔

وہ اپنے آپ کو سمجھا رہی تھی' میں اس کے قریب نہیں گئی تھی لیکن وہ ایسا گیم تیم ہے' پوری سیٹ پر اس طرح پھیلا ہوا ہے کہ میں دور بھی رہتی ہوں تو اسے پاس لگتی ہوں اور اتنا اونچا ہے کہ بیٹھے بیٹھے گاڑی کی چھت سے لگتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

وہ اس کی طرف سے منہ گھما کر کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اسے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ پھر گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ اس

نے سوچا' پلٹ کر بتائے کہ ذرا آگے جاکر کس طرح گیئر بدلنا ہے وہ اسے بتانے سے پہلے رومال نکال کر چہرے سے پسینہ پونچھنے لگی۔ اس نے اب تک یہی دیکھا تھا کہ پتھر سے پتھر ٹکرائے تو چنگاری نکلتی ہے۔ کمال ہے' آج پسینہ نکل رہا ہے۔

وہ سوچنے کے دوران چونک گئی۔ آہستہ آہستہ رینگنے والی گاڑی خاصی رفتار سے بھاگی جارہی تھی۔ اس نے گھبرا کر سرور کو دیکھا پھر کہا۔ "رفتار کم کرو' ورنہ کسی گاڑی سے ٹکرا دو گے۔"

سرور نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ وہ نظریں چراتی ہوئی بولی۔ "میری طرف نہ دیکھو۔ اس اسکرین کے پار دیکھتے رہو۔ اسٹیئرنگ کا خیال رکھو۔ ارے وہ دیکھو' ہیوی ٹرک آرہا ہے' رفتار کم کرو۔ گاڑی کو ایک کنارے کردو۔"

اس نے ہدایت کے برعکس رفتار بڑھائی۔ آگے جانے والی گاڑی کو اوورٹیک کیا۔ سامنے سے آنے والے ہیوی ٹرک کو کراس کیا پھر رفتار بڑھاتے ہوئے کن انکھیوں سے دیکھنے لگا۔ وہ حیرانی سے کبھی اسپیڈو میٹر کے کانٹے کو دیکھ رہی تھی۔ رفتار کو سمجھ رہی تھی اور کبھی پلٹ کر پیچھے رہ جانے والی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی تب وہ خوشی سے ذرا قریب ہو کر بولی۔ "تم تو بڑی مہارت سے ڈرائیو کرلیتے ہو پھر اناڑی کیوں بن رہے تھے؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "اس بہانے تم قریب تو آگئیں۔"

وہ سیٹ پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ پشت سے ٹیک لگا کر بڑی آہستگی سے بولی۔ "میری ذات میں دلچسپی نہ لو۔"

"میں نے آج تک کسی عورت میں دلچسپی نہیں لی۔ تم پہلی عورت ہو' جانے کیوں پہلی نظر میں ہی اچھی لگ رہی ہو اور جتنا وقت ہم ساتھ گزارتے جائیں گے' تم اتنی ہی اچھی لگتی رہو گی۔"

وہ منہ پھیر کر بولی۔ "میں بیوہ ہوں۔"

"بیوہ کوئی گالی نہیں ہے۔"

"میں نے ایک بچے کو جنم دیا ہے۔"

"ہر عورت شادی کے بعد ماں بننے کا حق رکھتی ہے۔"

وہ پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "ہماری بات محبت سے

شروع ہوگی۔ شادی تک پہنچے گی لیکن میں شادی کے بعد ماں نہیں بننا چاہتی۔"

"میرا خیال ہے تم پوری طرح نارمل نہیں ہو۔"

"تم نے ایسا خیال کیوں قائم کیا؟"

"تم بڑی دانشمندی کی باتیں کرتی ہو لیکن بچے کے معاملے میں بہک جاتی ہو۔ اس وقت تم نے خود ہی کھلونے فرش پر بکھیرے اور کہنے لگیں' بلو آکر انہیں بے ترتیب کردیتا ہے۔ تم بعد میں انہیں ترتیب سے رکھو گی۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟"

"یہی ہوا کہ بلو آتا ہے۔ کھلونوں سے کھیلتا ہے پھر انہیں فرش پر اسی طرح چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔"

"کہاں ہے تمہارا بلو؟"

"اسے صرف میں دیکھتی ہوں۔ کوئی اور نہیں دیکھ سکتا اور یہ اچھا ہی ہے کہ کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے اسے اپنے اندر قید کرلیا ہے۔ باہر نکلنے نہیں دیتی۔ نہ وہ باہر نکلے گا' نہ میں اسے سینے سے لگاؤں گی اور نہ ہی کوئی اسے گولی مارے گا۔"

سرور کی سمجھ میں نہیں آیا' کیا جواب دے' وہ بولی۔ "میں اسی لئے شادی نہیں کرتی۔ جو بھی میرا جیون ساتھی آئے گا وہ میرے بلو کو میرے وجود سے باہر لانا چاہے گا۔ کیا وہ اس بات کی ضمانت دے گا کہ میرے شہر میں پھر گولیاں نہیں چلیں گی اور کوئی اندھی گولی میرے بچے کو نہیں لگے گی۔"

وہ ذرا چپ ہوئی پھر بولی۔ "میں جانتی ہوں' آج ہمارے ہاں جیسی دہشت گردی پھیلی ہوئی ہے۔ جیسی تخریب کاری ہو رہی ہے' کوئی بھی صاحبِ عقل اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا جب ضمانت نہیں دے سکتا تو پھر اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایک بچے کو اس دنیا میں لائے۔"

وہ کہنا چاہتا تھا' میں تمہارے بلو کو اس دنیا میں لانے کا حق حاصل کرنا چاہتا ہوں' اسی لئے اتنے پاپڑ بیل رہا ہوں۔ آج تمہارے ساتھ تین سو میل کا سفر کر رہا ہوں۔ کل ساری زندگی کا سفر کرنے کے سلسلے میں تم مجھ پر اعتماد کرو گی۔

لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ سامنے پولیس چوکی آگئی تھی.......... راستے سے گزرنے والی گاڑیوں کی چیکنگ ہو رہی تھی۔ ایک افسر نے قریب آکر' ذرا جھک کر خالدہ کو دیکھا پھر

مسکرا کر کہا۔ ”ہیلو مادام‘ چھت کا سامان بتا رہا ہے‘ لمبے سفر پر جارہی ہیں۔“

خالدہ نے ڈیش بورڈ کے خانے کو کھولا۔ اس میں سے ایک لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ افسر نے اسے کھولے بغیر تہہ کرکے جیب میں رکھ لیا اور شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ جاسکتی ہیں۔“

سرور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کچھ دور جاکر بولا۔ ”لفافے میں کیا تھا۔“

”سو سو کے دس نوٹ تھے۔ دس ہڈیاں تھیں وہ انہیں سونگھتا رہے گا اور ہم آگے نکل جائیں گے۔“

”کیا ہماری گاڑی میں ایسی کوئی قابلِ اعتراض چیز ہے؟“

”ہاں‘ ہمارے پاؤں تلے دوہرا فرش ہے۔ اس کے درمیان کلاشنکوف اور سیون ایم ایم کی رائفلیں ہیں۔ سیٹوں کے نیچے کارتوس کی پیٹیاں ہیں۔ ہمارا کوئی بھی آدمی شہر سے کیمپ کی طرف جاتا ہے تو یہ سامان لے جاتا ہے کیونکہ کیمپ میں سیکھنے والے زیادہ ہیں اور سامان کی زیادہ ضرورت پڑتی رہتی ہے۔“

اس نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھا پھر سر گھما کر پیچھے کی جانب دیکھا۔ اس کے بعد کہنے لگی۔ میں بہت دیر سے دو گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی جو کبھی ہم سے دور نکل جاتی ہیں اور کبھی بہت پیچھے آجاتی ہیں۔

یہاں آگے ایک مڈوے ہوٹل ہے۔ ہم چائے پینے کے لئے وہاں رک جائیں گے پھر اگر وہ گاڑیاں بھی وہاں رک جائیں گی یا نظروں سے اوجھل ہوجائیں گی اور بعد میں پھر نظر آئیں گی تو ہمارا تعاقب کئے جانے کی تصدیق ہوجائے گی۔

ابھی مڈوے ہوٹل دور ہے۔ اس سے پہلے ہی ہمیں ایک کچے راستے پر مڑجانا ہے۔“

”یہ اور بھی اچھی بات ہے۔ اگر وہ بھی اسی راستے پر آئیں گی تو پھر ہم ان سے نمٹ لیں گے۔“

وہ آگے بڑھ کر ایک کچے راستے پر مڑگئے۔ اس سے پہلے کھڑکیوں کے شیشے چڑھا دیئے گئے کیونکہ تمام راستے گرد اڑتی رہتی تھی۔ گاڑی کے آگے راستہ صاف ہوتا تھا لیکن پیچھے گرد کی گہری دھند پھیل جاتی تھی۔ دیکھو تو کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایسے میں

تعاقب کرنے والے نظر نہیں آسکتے تھے۔

تقریباً دس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد پیچھے گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ خالدہ نے گھوم کر پیچھے کی جانب دیکھا۔ سرور بھی عقب نما آئینے میں دیکھ رہا تھا لیکن گرد کے طوفان میں گاڑی دکھائی نہیں دے رہی تھی‘ صرف آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”میں گاڑی ایک سائیڈ پر کرکے انہیں گزرنے کا راستہ دے رہا ہوں۔“

خالدہ نے کہا۔ ”ذرا ٹھہرو۔“

اس نے ڈیش بورڈ کے نچلے خانے کو کھولا۔ وہاں ایک بلاسٹک گن رکھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی موٹے موٹے کارتوس کی ایک پٹی تھی۔ اس گن میں ایک کارتوس رکھ کر فائر کیا جاتا تو جہاں وہ کارتوس جاکر پھٹتا تھا‘ وہاں ایسا دھماکہ ہوتا جیسے بم پھینکا گیا ہو۔ آگ کے شعلے نکلتے تھے اور اس کی زد میں آنے والوں کے چیتھڑے اڑ جاتے تھے۔

خالدہ نے اس گن کو لوڈ کیا پھر جھک کر پچھلی سیٹ پر گئی۔ اس کے بعد بولی۔ ”اب انہیں راستہ دو۔“

سرور رفتار دھیمی کرکے گاڑی کو ایک کنارے کرنے لگا۔ پیچھے سے آنے والی گاڑی تیز رفتاری کے ساتھ آئی‘ انہیں اوورٹیک کرتی ہوئی‘ دھول اڑاتی ہوئی آگے چلی گئی۔ اس کے آگے جانے کے بعد سرور اور خالدہ کو غلطی کا احساس ہوا۔ انہیں اوورٹیک کرنے کا موقع نہیں دینا چاہئے تھا کیونکہ آگے جانے والی گاڑی دھول اڑاتی جارہی تھی۔ پیچھے پہلے ہی گرد کا طوفان تھا۔ آگے بھی دھند چھاگئی۔ یعنی اب نہ آگے راستہ دکھائی دیتا تھا نہ پیچھے۔ اس وقت پھر پیچھے سے گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ اب دوسری گاڑی پیچھے سے آرہی تھی۔ یعنی وہ آگے پیچھے دو گاڑیوں کے درمیان رہ گئے تھے۔ گرد کے طوفان میں وہ دکھائی نہیں دے رہی تھیں لیکن دونوں ہی ہارن بجاتی جارہی تھیں‘ جیسے خطرے کا سائرن سنا رہی ہو۔

سرور نے پوچھا۔ ”اب کیا کروگی؟“

”میں نے بھی کیمپ میں رہ کر خاص ٹریننگ حاصل کی ہے۔ ایسے وقت دو ہی باتیں ہوتی ہیں۔ ڈو اینڈ ڈائی۔ یعنی کچھ کر جاؤ اور مرجاؤ۔“

گاڑی کی چھت میں ایک بڑا سا چوکور خلا تھا۔ اس خلا کو سلائیڈنگ پلیٹ کے ذریعے

بند رکھا جاتا تھا۔ اس نے اس پلیٹ کو ایک طرف سرکایا۔ چھت پر خیمے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ وہ اس خلا سے ہاتھ گزار کر خیمے کے سامان کو ایک طرف ہٹانے لگی۔ پھر راستہ بن جانے کے بعد خود اس خلا سے گزر کر آدھی اوپر ہوگئی اسی وقت میگا فون سے کہا گیا۔ ”تم دونوں طرف سے گھر گئے ہو۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ گاڑی ایک طرف روک دو اور دونوں ہاتھ اٹھا کر باہر چلے آؤ۔“

خالدہ نے خلا میں سے غروب ہو کر' ویگن کے اندر آکر سرور سے کہا۔ ”جیسے ہی میں فائر کروں اور دوسری طرف بلاسٹنگ ہو' تم فوراً ہی گاڑی کو کچے راستے سے اتار کر دوسری طرف لے جانا۔“

یہ کہہ کر وہ پھر خلا سے باہر ابھری۔ آگے جانے والی گاڑی تقریباً دس گز کے فاصلے پر ہوگی۔ چونکہ اس گاڑی کے آگے گرد کی دھند نہیں تھی' اس لئے اسے آسانی سے دیکھا جاسکتا تھا۔ خالدہ نے اس کا نشانہ لیا پھر ٹرائیگر دبا دیا۔ دوسرے ہی لمحے اس گاڑی کے پاس زبردست دھماکا ہوا۔ سرور اپنی گاڑی کچے راستے سے اتار کر دوسری طرف لے جا رہا تھا۔ آگے جانے والی گاڑی سے چیخنے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ سب گاڑی سمیت شعلوں کی لپیٹ میں آگئے تھے۔ خالدہ نے گھوم کر پیچھے آنے والی گاڑی کی طرف دیکھا۔ وہ دھند میں چھپی ہوئی تھی۔ ابھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر وہ دکھائی دینے لگی.......... وہاں سے.......... فائرنگ شروع ہوگئی۔ وہ فوراً ہی خلا میں غروب ہوگئی۔ کہنے لگی۔ ”گاڑی کو گھنے درختوں کے درمیان روکو۔“

گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ وہ فوراً ہی دروازہ کھول کر چھلانگ لگاتی ہوئی باہر گئی پھر دوڑتے ہوئے ایک درخت کے موٹے سے تنے کے پیچھے کھڑی ہوگئی۔ اتنی دیر میں کچے راستے کی دھند چھٹ رہی تھی۔ گاڑی صاف نظر آرہی تھی۔ اس نے نشانہ لے کر گولی داغ دی۔ پھر دوسری گاڑی میں بھی دھماکا سا ہوا۔ اس کے چیتھڑے اڑتے ہوئے' شعلے لپکے' چیخیں سنائی دیں۔ وہ غصے سے لپکتے ہوئے شعلوں کو اور پھیلتے ہوئے دھوئیں کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں گاڑیوں کی پٹرول کی ٹنکیاں پھٹ گئی تھیں۔ دھماکا اور زور دار ہو رہا تھا۔ شعلے اور زیادہ لپک رہے تھے۔ ان شعلوں کے عکس میں خالدہ کی آنکھیں آنسوؤں میں بھیگ رہی تھیں۔

اس نے گہری سانس لی۔ بلاسٹنگ گن کو اپنے کاندھے پر رکھا پھر اطمینان سے چلتی ہوئی ویگن کے پاس آئی۔ اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور اس پر بیٹھ گئی۔ سرور نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ وہ جلدی سے آنکھیں پونچھنے لگی۔ اس نے پوچھا۔ ”تم رو رہی ہو؟“

وہ ہاں کے انداز میں سر ہلا کر پھر آنسو پونچھنے لگی۔ سرور نے کہا۔ ”ارے تمہیں تو خوش ہونا چاہئے۔ نہ جانے وہ دشمن کتنی تعداد میں تھے۔ تم نے صرف دو فائر کئے اور گاڑیوں سمیت ان کے چیتھڑے اڑا دیئے۔“

وہ سرور کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ہاں میں نے ایسا کیا لیکن یہ شیطان کے بچے مرتے وقت چیختے کیوں ہیں۔ کیا مرتے مرتے فریاد کرتے ہیں؟ میرا بچہ تو ایک ہی گولی میں خاموش ہوگیا تھا۔ اس کے منہ سے ایک ہلکی سی آواز بھی نہیں نکلی تھی۔ اس نے فریاد نہیں کی۔ یہ قاتل اور جوانمرد ہو کر کیوں چیختے ہیں؟“

سرور نے چپ چاپ گاڑی اسٹارٹ کی' اسے ڈرائیو کر کے ایک لمبا چکر کاٹ کر پھر کچی سڑک پر آگیا۔ ان کے پیچھے آنے والے لاشوں کی صورت میں پیچھے ہی رہ گئے تھے۔ وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ خالدہ نے ڈیش بورڈ کا نچلا حصہ کھول کر بلاسٹنگ گن وہاں رکھ دی۔ فی الحال کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ سرور نے پوچھا۔ ”یہ کون لوگ ہوسکتے ہیں؟ آپ کے بھائی سلطان بیگ کہہ رہے تھے' ان پر شبہ کیا جا رہا ہے۔ انٹیلی جنس کے آدمی ان کے متعلق معلومات حاصل کرتے پھر رہے ہیں۔ ان پر شبہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تم پر بھی شبہ کیا جاسکتا ہے۔“

”ہاں' یہ ممکن ہے لیکن ابھی ہمارا تعاقب کرنے والے انٹیلی جنس کے لوگ نہیں تھے۔ وہ سرکاری لوگ ہوتے ہیں اس طرح ویرانے میں راستہ نہیں روکتے۔ کھل کر سامنے آتے ہیں۔ ضرورت کے مطابق سوالات کرتے ہیں پھر چلے جاتے ہیں۔ جانے کے باوجود پیچھا نہیں چھوڑتے۔ ایسے لوگ چپ چاپ تعاقب کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں ہماری منزل کہاں ہے؟ ہم کہاں پہنچنے والے ہیں؟ اور وہاں پہنچ کر کیا کرنے والے ہیں؟“

”تو پھر یہ کون لوگ تھے؟“

وہ بولی۔ ”حملہ مجھ پر ہوا تھا' تم پر نہیں ہوا تھا۔ بلو کی ہلاکت کے ایک سال بعد آج گھر سے اتنی دور آئی ہوں۔ اس سے پہلے میں تنہا شہر میں شاپنگ وغیرہ کے لئے جاتی

تھی یا کسی تقریب میں شریک ہوتی تھی تو وہاں بھائی صاحب کے خاص آدمی میری نگرانی کرتے تھے۔ میرے دشمنوں کو مجھ تک پہنچنے کا موقع نہیں مل رہا تھا مگر آج مل گیا۔ ان لوگوں نے کرائے کے بدمعاشوں کو بھیجا ہوگا اب انہیں پتا چلے گا کہ میں نے بڑی خاموشی سے کیسی زبردست ٹریننگ حاصل کی ہے۔"

"لیکن یہ دشمن ہیں کون؟"

"ظاہر ہے میرے بچے کو ہلاک کرنے والے' میری دولت اور جائیداد کے طلبگار ہی ہوسکتے ہیں۔ وہ کھل کر سامنے نہیں آتے اور نہ ہی دشمنی ظاہر کرتے ہیں بلکہ نصیحتیں کرتے ہیں۔ شادی کا پیغام بھیجتے ہیں۔ کہتے ہیں' میں پہاڑ جیسی جوانی کیسے گزاروں گی۔ ایک حسین اور جوان بیوہ بڑے مسائل سے گزرتی ہے اور ان مسائل کا سامنا اس کا کوئی جیون ساتھی ہی کرسکتا ہے۔ جب کہ میں نے شادی سے صاف صاف انکار کردیا ہے اور یہ کہہ دیا ہے کہ میرے شوہر کی دولت اور جائیداد کا وارث موجود ہے اور اس کی موجودگی میں اب میں شادی نہیں کروں گی۔"

وہ ایک لمحے کے لئے چپ ہوئی' ایک گہری سانس لی پھر بولی۔ "اس انکار کے بعد ہی وہ قیامت کی گھڑی آئی۔ میں اپنے بچے کو سینے سے لگائے ایک شاپنگ سینٹر سے نکل کر کار کی طرف جارہی تھی' تب ہی چند نامعلوم لوگوں نے فائرنگ کی۔ وہ جیپ پر سوار تھے اور فائرنگ کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ مجھے ایک ذرا سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا کیوں کہ بچے کو گولی لگتے ہی جب وہ ٹھنڈا پڑ گیا تو میں بھی ساکت ہوگئی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا' ایسے وقت کیا کرنا چاہئے۔ جب یقین ہوگیا کہ میرا بچہ میرے سینے سے لگ کر ہی مجھ سے جدا ہوگیا ہے تو میں چکرا کر گر پڑی۔"

"تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ تمہارے لالچی رشتے داروں نے بلو کو ہلاک کیا جب کہ ہمارے شہروں میں دہشت پھیلانے والے شرپسند عناصر اکثر ایسی فائرنگ کرتے ہوئے گزرتے ہیں۔"

"پہلے ذاتی یا خاندانی دشمنی روبرو ہوتی تھی جو زیادہ طاقت ور ہوتا' وہ اپنے سامنے والے کو پچھاڑ دیتا تھا یا جس کے پاس ہتھیار یا کرائے کے آدمی زیادہ ہوتے تھے' وہ اپنے دشمنوں کو ہلاک کردیتا تھا۔ دشمنی خواہ کسی طریقے سے بھی ہوتی' ظاہر ہوجاتا کہ یہ ذاتی یا

خاندانی دشمنی ہے لیکن فی زمانہ دہشت گردوں نے ذاتی دشمنی کرنے والوں کے لئے سہولتیں پیدا کردی ہیں۔ وہ انتقام لیتے ہیں اور الزام دہشت گردوں کے سر آتا ہے۔ میرے بچے کی ہلاکت کے دو دن بعد ہی کسی نے ٹیلیفون پر کہا۔ تمہاری کروڑوں کی جائیداد کا وارث بھی گیا۔ اب کیا کروگی۔ ہمارا نیک مشورہ ہے تمہارے سامنے دیوانوں اور مہربانوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ کسی کا انتخاب کرلو کسی کو اپنا جیون ساتھی بناؤ اور جائیداد کا ایک نیا وارث پیدا کرلو۔"

بات واضح ہوچکی تھی۔ کروڑوں کی جائیداد کے لئے بلو کو ہلاک کیا گیا تھا لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہ تھا۔ پولیس والوں نے عام حالات کے مطابق یہ رائے قائم کی تھی کہ شرپسندوں کی فائرنگ سے ایسا ہوگیا ہے۔ گاڑی کچے راستے پر ایک مخصوص رفتار سے جا رہی تھی۔ وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی اس کے بھائی صاحب' سلطان بیگ نے مشورہ دیا تھا۔ "خالدہ! شادی کے لئے راضی ہوجاؤ۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں قاتل کو بے نقاب کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا ایک قاتل کو بے نقاب کرنے کے لئے میں اپنی ساری زندگی ایک اجنبی کے حوالے کردوں؟"

"ایسا کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ صرف شادی کا اعلان کرو کہ تم ایک جیون ساتھی کا انتخاب کرنے والی ہو۔ اس کے بعد میں سمجھ لوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے' شادی کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔"

جب بات اس کی سمجھ میں آئی تو وہ راضی ہوگئی۔ اس نے رشتے داروں میں صرف ایک بار کسی عورت کے سامنے کہا۔ "میں اپنے خاندان کے کسی فرد سے شادی کرنا چاہتی ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کسے اپنا جیون ساتھی بناؤں؟ میں کشمکش میں ہوں۔"

کوئی سی بات ہو' کسی ایک عورت کے کان میں پھونک دو پھر وہ بات کانوں کان پھونکیں مارتی چلی جاتی ہے۔ خالدہ کسی کا انتخاب کرنے والی تھی۔ یہ الیکشن جیسا معاملہ تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ اس کے امیدواروں میں کون زیادہ جوڑ توڑ کرکے اس کا شوہر اور اس سے ہونے والے وارث کا باپ بننا چاہتا ہے۔

☆======☆======☆

وہ تین بھائی تھے۔ خالدہ کی شادی بڑے بھائی امانت علی سے ہوئی تھی۔ امانت علی کاروبار کے معاملے میں بہت ہی ذہین اور تیز و طرار تھا۔ باپ نے تینوں بھائیوں میں زمینیں برابر تقسیم کی تھیں باقی دو بھائی ریاست علی اور حشمت علی اپنی زمینوں تک ہی محدود رہ گئے۔ امانت علی نے شہر میں کاروبار شروع کیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے فائیو اسٹار ہوٹل کا مالک بن گیا۔ دوسری طرف مزید زمینیں بھی خریدتا گیا۔ اس طرح وہ مرنے سے پہلے خالدہ کو اور اپنے بیٹے ببلو کو کروڑوں کی جائیداد کا مالک بنا چکا تھا۔

ریاست علی اکثر نوابی شان سے کوٹھوں پر جایا کرتے تھے۔ ایک گانے والی پر دل آگیا۔ دو برس تک اس کے کوٹھے پر چڑھتے اترتے رہے۔ وہ ناچنے گانے والی ان کا دل بہلاتی تھی لیکن کسی کی خواب گاہ میں نہیں جاتی تھی۔ اس کی ماں کہتی تھی۔ "میری بیٹی ہیرا سچ مچ ایک تراشیدہ ہیرا ہے' ماہانہ تیس ہزار روپے پر جائے گی۔ منظور ہے تو نقدی پھینکو اور شوق سے لے جاؤ ویسے میاں! ہم اسے گناہ سمجھتے ہیں۔ میری ہیرا سے شادی کرو گے تو فائدہ میں رہو گے۔ یہ ہمیشہ کے لئے تمہارے گھر کی ہوجائے گی۔ پھر ماہانہ تیس ہزار کا نہیں' صرف پندرہ ہزار کا معاہدہ ہوگیا۔"

یاروں نے سمجھایا۔ "اگر ہیرا سے سچا عشق ہے تو اسے اس بدنام گلی سے نکال کر لے جاؤ۔ شادی کرلو۔ ایک تو اسے شریفوں کی دنیا میں لاکر ثواب کماؤ گے' دوسرے اس کی قیمت آدھی ہوجائے گی۔ تمہاری جیب پر ماہانہ تیس ہزار کا بوجھ نہیں پڑے گا۔"

ریاست علی ہر قیمت پر ہیرا کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ شادی کرنے سے اس کی قیمت آدھی ہورہی تھی۔ وہ اسے حاصل کرنے کے شوق میں بھول گئے تھے کہ عورت بازاری ہو یا شریف زادی شادی کے بعد اس کی آدھی اہمیت رہ جاتی ہے۔ وہ شادی کے لئے راضی ہوگئے۔ ہیرا کی ماں نے کہا۔ "مہر کی رقم دس لاکھ روپے لکھائی جائے گی۔"

وہ پریشان ہوکر بولے۔ "یہ تو بہت ہے۔ میں دس لاکھ ادا کرنے کے بعد کنگال ہوجاؤں گا۔"

"کون تمہیں ادا کرنے کو کہتا ہے؟ کیا شادی کے بعد اسے چھوڑنے کا ارادہ ہے؟"

"ہرگز نہیں۔ میں اس سے سچی محبت کرتا ہوں۔ بھلا اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔"

"تو پھر بسم اللہ کرو۔"

اس نے ہیرا کے ساتھ ایک نئی زندگی کی بسم اللہ کی۔ خاندان والوں نے ایک طوائف کو گھر لانے پر اعتراض کیا لیکن وہ سچا عاشق تھا' اسے دلہن بناکر لے آیا۔ اس کا دعویٰ تھا اس نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ وہ کبھی نہیں پچھتائے گا۔ یقیناً وہ کبھی نہ پچھتاتا لیکن تین برس بعد بڑے بھائی امانت علی کا انتقال ہوگیا۔ ان تین برسوں میں ہیرا سے دل بھر گیا تھا۔ وہ ایک بچی کی ماں بن گئی تھی۔ ایسے وقت خیال آیا اگر وہ ہیرا کو گھر نہ لاتا تو بھائی کا چالیسواں ہوتے ہی وہ بیوہ بھابی کو نکاح کا پیغام بھیج سکتا تھا۔ اور نہ جانے کتنے ہی کنوارے اپنے بزرگوں کو خالدہ کے پاس بھیجنے لگے تھے۔ ان میں چھوٹا بھائی حشمت بھی تھا۔ حشمت کی ماں یعنی خالدہ کی ساس دعویٰ کرتی تھی۔ "بہو کہیں باہر نہیں جائے گی میرے ہی کسی بیٹے سے بیاہ کر اسی گھر میں رہے گی۔"

ہیرا نے ریاست علی سے کہا۔ "ہماری بیوہ بھابی خزانے کی چابی ہے۔ اگر میں نہ ہوتی تو یہ چابی تمہارے ہاتھ آجاتی۔"

"یہ اب بھی میرے ہاتھ آسکتی ہے۔ اگر تم دوستانہ انداز میں علیحدگی اختیار کرلو۔"

ہیرا نے کہا۔ "وہ شادی کے پیغامات کو ٹھکرا رہی ہے۔ صاف کہتی ہے' ساری زندگی اپنے بچے کے ساتھ تنہا گزار دے گی۔"

"اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ عورت حسین ہو' جوان ہو اور بے انتہا دولت مند ہو تو وہ کسی مرد کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتی۔ میں اس کی زندگی میں اتنے مسائل پیدا کردوں گا کہ وہ میرے حق میں فیصلہ کرنے پر مجبور ہوجائے گی لیکن میں تمہارے تعاون کے بغیر ایسا نہیں کرسکوں گا۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"ہم جھوٹ موٹ اعلان کریں گے کہ ہمارے درمیان طلاق ہوگئی ہے اور تم میری بیٹی کو لے کر کوٹھے پر واپس چلی گئی ہو۔"

"طلاق کا جھوٹا اعلان کبھی نہیں ہوتا۔ اعلان کا مطلب ہے کہ دنیا سن لے اور ہماری علیحدگی کا یقین کرلے۔ جب دنیا والے یقین کرلیں گے تو وہ سچ مچ طلاق ہوجائے گی' پھر تم پر میرا کوئی حق نہیں رہے گا۔ ریاست صاحب! میں اب بازاری نہیں ہوں کہ پھر

کوٹھے پر چلی جاؤں' وہ بھی آپ کی بیٹی کو لے کر۔ آپ کو تو ایسا سوچتے ہوئے بھی شرم آنی چاہئے۔"

"تم بات کو کہاں سے کہاں لے جارہی ہو میری بیٹی ایک برس کی ہے۔ تم کوٹھے پر جاتے ہی اس کے پاؤں میں گھنگھرو نہیں باندھو گی۔"

"طلاق کے بعد اپنے پاؤں میں باندھنے پر مجبور ہو جاؤ گی۔ آپ ہیرا پھیری کی باتیں نہ کریں۔ میری طرح صاف اور سیدھی بات کریں۔ آپ مہر کی پوری رقم ادا کریں گے تو میں بیٹی کو لے کر ہمیشہ کے لئے چلی جاؤں گی۔"

"ابھی میرے پاس دس لاکھ روپے نہیں ہیں۔"

"زمینیں تو ہیں۔"

"کیا میں تمام زمینیں بیچ کر کنگال ہو جاؤں۔"

"اگر کروڑوں کی رقم جیت لینے کا یقین ہے تو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دو۔"

"اگر میں بدبختی سے ہار گیا تو کیا ہوگا؟"

"وہی جو ہر جواری کا انجام ہوتا ہے۔"

"ہیرا! طعنے نہ دو۔ میری اپنی بن کر ساتھ دو۔ میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔ ہم اپنی بیٹی کا شاندار مستقبل بنائیں گے۔ میں جن کروڑوں روپے تک پہنچوں گا' وہ تمہارے ہی کام آئیں گے۔"

"مجھے ابھی جو مل رہا ہے' اس پر صابر اور شاکر ہوں۔ ایک شریف گھرانے میں آکر اور ماں بن کر کوٹھے پر جانا نہیں چاہتی۔ تم خالدہ کے لئے مجھے چھوڑنا چاہو گے تو بیٹی کو لے کر چلی جاؤں گی مگر پہلے اپنا حق حاصل کروں گی۔ تمہارے پاس نقد رقم نہیں ہے تو زمینیں میرے نام لکھ دو۔"

وہ ایک بار مہر کی رقم دس لاکھ روپے لکھوا کر پھنس گیا تھا۔ دوبارہ زمینیں اس کے نام لکھ کر پھنسنا نہیں چاہتا تھا اور وہ اپنے نام لکھوائے بغیر اس کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ ان حالات میں اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اپنے چھوٹے بھائی حشمت علی سے کہا۔ "تمہیں خالدہ کے انکار سے سمجھ لینا چاہئے کہ آئندہ وہ بیوگی کی زندگی گزارتی رہے گی' دوسری شادی کبھی نہیں کرے گی۔"

حشمت نے کہا۔ "وقت کے ساتھ ساتھ مزاج اور فیصلہ بدلتا رہتا ہے۔ اگر کبھی اس نے کسی سے شادی کی تو ہمارے مرحوم بھائی کی بے حساب دولت کسی غیر کے ہاتھ میں چلی جائے گی اور یہ ہماری انسلٹ بھی ہوگی اور شکست بھی۔"

ریاست نے کہا۔ "میرا ہیرا کو آسانی سے طلاق دے کر اسے اپنی زندگی سے نکال دینا' خالدہ کے انکار کو اقرار میں بدل کر اس سے شادی کرانے کا باعث بن سکتا ہے لیکن مجھے اپنی بیوی اور بچی سے محبت ہے۔ میں انہیں چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

حشمت نے کہا۔ "اگر آپ کے ذہن میں کوئی تدبیر ہے تو خالدہ کے انکار کو میری خاطر اقرار میں بدل دیجئے۔"

"میں کوئی چکر چلا کر تمہاری شادی اس سے کرا دوں تو مجھے کیا ملے گا؟"

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"بے چارے مرحوم کی دولت کا آدھا حصہ۔"

"مجھے منظور ہے۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم خالدہ سے شادی کرنے کے بعد دھوکا نہیں دو گے؟"

"میں کیا بتاؤں؟ ضمانت آپ چاہتے ہیں۔ آپ نے کچھ سوچا ہی ہوگا۔"

"ہاں۔ ہم ایک تحریری معاہدہ کریں گے کہ ہم دونوں اپنے مرحوم بھائی کی دولت اور جائیداد کو اپنے ہی گھر تک محدود رکھنے کے لئے آپس میں ایک کاروباری معاہدہ کر رہے ہیں۔ میں کسی طرح خالدہ کو شادی پر مجبور کروں گا۔ حشمت اس سے شادی کرے گا لیکن مرحوم بھائی کی تمام دولت اور جائیداد میں ہم دونوں بھائیوں کا برابر کا حصہ ہوگا۔"

"آپ یوں کہہ رہے ہیں جیسے شادی کے بعد خالدہ ساری دولت میرے حوالے کردے گی۔"

"ضرور کرے گی۔ نہیں کرے گی تو موت سے پہلے مرے گی پھر مرحوم بیوی کی دولت کے تم ہی مالک ہوگے۔"

"اس کے بیٹے ببلو کا کیا ہوگا؟"

"یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں ہر حال میں تمہیں کروڑوں کا مالک بنا دوں گا۔"

"آپ اتنے یقین سے کہہ رہے ہیں تو میں اس مجرمانہ معاہدے کے لئے تیار ہوں۔ مگر اس بات کا خیال رہے کہ معاہدے کی تحریر ایسی ہوگی جس کے ظاہر ہونے سے ہم دونوں پھنسیں گے اور جسے راز میں رکھنے سے دونوں کے وارے نیارے ہوجائیں گے۔"

دونوں نے خوب سوچ سمجھ کر تحریری معاہدہ کیا۔ اس معاہدے پر گواہ کی حیثیت سے ان کی امی جان نے دستخط کئے' یوں خزانے تک پہنچنے کا ایک مرحلہ طے ہوگیا۔ ریاست علی سے ایک ایسے وکیل کی دوستی تھی جو ہمیشہ مجرموں کی حمایت میں مقدمے لڑتا تھا۔ اکثرانہیں یقینی سزاؤں سے بچالیتا تھا۔ ڈرگ مافیا کے غنڈے ہوں یا دشمن ممالک کے ایجنٹ سب ہی اس وکیل کو جانتے تھے' مانتے بھی تھے اور بھاری معاوضے پر اس کی خدمات بھی حاصل کرتے تھے۔ ریاست علی اس وکیل کے ذریعے دہشت گردوں تک پہنچ گیا۔

خالدہ نے آنے والے رشتوں کو ٹھکراتے ہوئے کہا تھا۔ "میں اپنے بیٹے بلو کے سہارے پہاڑ جیسی زندگی گزار لوں گی۔"

ریاست علی نے دہشت گردوں کے ایک پارٹی لیڈر کے سامنے دس ہزار روپے رکھتے ہوئے خالدہ اور بلو کی تصویریں دکھائیں پھر کہا۔ "اس بچے کو ختم کردو۔ کام ہونے پر اور دس ہزار دوں گا۔ اس بات کا خاص خیال رکھنا کہ بچے کی ماں کو نقصان نہ پہنچے۔"

قاتلوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا۔ جب وہ شاپنگ سنٹر سے باہر آرہی تھی تب ان میں سے ایک نے ٹیلی سکوپ لگی ہوئی رائفل سے نشانہ لیا تاکہ ذرا سی بھی چوک نہ ہو' خالدہ کو گولی نہ لگے پھر یہی ہوا۔ ننھے بلو کے لئے ایک گولی نکلی تھی لیکن وہ مسلسل فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہوئے تاکہ لوگوں پر دہشت طاری ہوجائے اور یہی خیال قائم کیا جائے کہ ایک معصوم بچے کا قتل محض اتفاق سے ہوا ہے۔ دہشت گردوں کی بلاجواز فائرنگ سے اسی طرح بے گناہ افراد مارے جاتے ہیں۔ لہٰذا ایک بچہ بھی مارا گیا۔

آج ہماری دنیا میں یہی ہو رہا ہے۔ عورت کے لئے' دولت کے لئے اور اقتدار کے لئے گھر بیٹھے کسی بھی مخالف کو گولی ماری جاسکتی ہے۔ دہشت گرد یہ الزام اپنے سر لیتے ہیں اور اصلی قاتل کبھی قانون کی گرفت میں نہیں آتا۔ یوں دہشت گرد تنظیموں کو تین بڑے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ ایک تو بھاری معاوضہ ملتا ہے دوسرے اس بہانے

دہشت گردی کا عمل جاری رہتا ہے اور تیسرے حکومت کو بلیک میل کیا جاتا ہے کہ منشیات اور اسلحے کو مقامی منڈی اور بیرونی ممالک تک پہنچنے سے روکا گیا تو آئندہ بھی سر راہ لاشیں گرتی رہیں گی۔

ایک ماں نے دونوں بیٹوں کے معاہدے پر دستخط کئے تھے۔ بڑے بیٹے کی بیوہ کو پھر اپنی بہو بنانے اور بے انتہا دولت کو اپنے گھر تک محدود رکھنے کے لئے دو بیٹوں کی سازشوں میں شریک تھی مگر بیٹوں نے یہ نہیں بتایا کہ بلو ان کی سازش سے مارا گیا ہے۔ کیوں کہ بلو ان کا پوتا تھا۔ وہ اپنے بڑے بیٹے کے خون کا خون بہانے کی کبھی اجازت نہ دیتی۔ بہرحال ریاست علی اور حشمت علی نے خزانے تک پہنچنے کا دوسرا مرحلہ طے کرلیا تھا۔ اب خالدہ رہ گئی تھی' جس کے تن کا مالک بننے والا دھن کا مالک بھی بن سکتا تھا۔

کچھ عرصے تک دونوں بھائیوں نے انتظار کیا۔ فون پر اجنبی بن کر مشورہ دیا کہ بلو اب نہیں رہا۔ لہٰذا اسے جائیداد کا وارث پیدا کرنے کے لئے دوسری شادی کرنی چاہئے لیکن خالدہ کی طرف سے خاطر خواہ ردِ عمل نہ ہوا۔ وہ بڑی خاموشی سے اپنے اندر بلو کی لاش اٹھائے جی رہی تھی۔ حشمت علی نے کہا۔ "بھائی جان! ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اس نے ایک تگڑے جوان کو باڈی گارڈ بنا رکھا ہے۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیسا رنگین و سنگین وقت گزارتی ہے۔ جس عورت کی ہر خواہش چوری چھپے پوری ہوتی رہے وہ بھلا دوسری شادی کیوں کرے گی؟"

ریاست علی نے کہا۔ "تمہاری بات دل کو لگتی ہے عورت خواہ کتنی ہی سنجیدہ اور شرمیلی ہو' اسے تنہائی میں بہکتے دیر نہیں لگتی۔ اب ہمیں اس کی تنہائیوں کا بھی حساب رکھنا ہوگا۔"

ایک ہفتے کے اندر ہی کرائے کے قاتلوں نے خالدہ کے باڈی گارڈ کو گولی مار دی۔ ریاست نے پھر فون پر اجنبی بن کر کہا۔ "باڈی گارڈ کے معنی ہیں' بدن کا محافظ' تمہارے بدن کا محافظ تمہارا دوسرا شوہر ہوگا۔ آئندہ کوئی باڈی گارڈ رکھنے کی حماقت نہ کرنا۔"

اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ خالدہ نے کوئی دوسرا باڈی گارڈ نہیں رکھا لیکن بہت ہی ضدی عورت تھی۔ شادی کے لئے راضی نہیں ہو رہی تھی۔ حشمت نے کہا۔ "بھائی جان! اس کے فائیو اسٹار ہوٹل میں دھماکا کرنا چاہئے۔ ہم اسے جتنا پریشان کریں گے اتنا ہی

وہ کمزور اور مجبور ہوتی جائے گی۔"

ریاست علی نے کہا۔ "عقل کی بات کرو' اس ہوٹل میں بڑے بڑے سرمایہ دار آتے ہیں۔ وہاں ایک بار دھماکا ہوگیا تو پھر کوئی نہیں آئے گا۔ وہاں اُلّو بولیں گے۔ آج نہیں تو کل وہ ہوٹل ہمارے قبضے میں ہوگا۔ کیا تم چاہتے ہو ہماری لاکھوں کی آمدنی ہمارے ہی ہاتھوں ختم ہوجائے؟"

دشمنی صرف خالدہ سے ہوسکتی تھی' اس کی زمین وجائیداد سے نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ اس کی زمینوں پر جاکر کھڑی فصلوں کو آگ نہیں لگا سکتے تھے۔ ایسی حرکت کرنے سے ان پر شبہ ہوسکتا تھا کیونکہ دہشت گرد صرف شہروں میں قتل وغارت گری کا مظاہرہ کرتے تھے۔ انہوں نے آج تک ملک کی زراعت کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ نہ کسی کھیت کو جلایا تھا اور نہ ہی منڈی کے اناج کو کبھی ضائع کیا تھا۔

چند ماہ کے بعد دونوں بھائیوں کو اطلاع ملی کہ ایک نوجوان باڈی بلڈر خالدہ کی کوٹھی میں آیا تھا۔ وہ دوپہر تک اس کے ساتھ رہی پھر ایس پی سلطان بیگ وہاں پہنچا۔ تینوں نے ایک میز پر کھانا کھایا اور اب دوسرے دن خالدہ اس باڈی بلڈر کے ساتھ کہیں جانے والی ہے۔

سوال پیدا ہوا' وہ ایک خوبرو جوان کے ساتھ تنہا کہاں جارہی ہے؟ حشمت نے کہا۔ "ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنے جارہی ہے۔ کسی دوسرے شہر جاکر اس سے شادی کرے گی پھر یہاں آکر اپنی ازدواجی زندگی کا اعلان کرے گی اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔"

ریاست نے کہا۔ "ایسا نہیں ہوگا۔ ہمارے منصوبے کی کامیابی اسی میں ہے کہ وہ کسی مرد کے قریب نہ رہے۔ قریب رہنے والے ایک باڈی گارڈ کو ختم کیا گیا تھا۔ اب اس نوجوان باڈی بلڈر کو بھی ٹھکانے لگایا جائے گا تو آئندہ وہ کسی بھی مرد کے قریب نہیں جائے گی۔"

انہوں نے تیسرے قتل کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کے مطابق ایک باڈی بلڈر کو قتل کرنا تھا اور خالدہ کو اغوا کرکے کسی خفیہ اڈے میں پہنچانا تھا۔ اس مقصد کے لئے قاتلوں اور اغوا کرنے والوں کو دو گاڑیوں میں روانہ کیا گیا۔ ان سے ٹرانسمیٹر کے ذریعے

رابطہ قائم تھا۔ پہلے تو اطلاع ملی کہ خالدہ اس جوان کے ساتھ ایک ویگن میں جارہی ہے۔ اس کی چھت پر خیمہ نصب کرنے کا سامان رکھا ہوا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ ان کا سفر بہت طویل ہوگا اور وہ رات کو کہیں قیام کریں گے۔

ٹرانسمیٹر سے یہ ہدایت دی گئی کہ آرام سے تعاقب کریں' جلد بازی سے کام نہ لیں۔ کوئی ویران سی جگہ ہو تو وہاں انہیں گھیرا جائے' ورنہ رات ہونے کا انتظار کیا جائے۔

دونوں گاڑیوں میں تعاقب کرنے والے ہدایت پر عمل کررہے تھے۔ جب خالدہ کی گاڑی کچے راستے سے گزرتی ہوئی ایک ویران علاقے میں پہنچی تو انہوں نے اسے گھیر لیا پھر ان کا جو انجام ہوا اسے ریاست علی اور کرائے کے دہشت گرد اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے۔ آخری بار ٹرانسمیٹر سے یہی اطلاع ملی تھی کہ وہ ایک ویرانے میں دونوں کو گھیر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ٹرانسمیٹر سے رابطہ قائم کریں گے اور خوش خبری سنائیں گے۔

یہ آخری رابطہ دن کے بارہ بجے ہوا تھا۔ انتظار کرنے والوں کو دو بجے تک معلوم نہ ہوسکا کہ خوش خبری سنانے والے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ ایک دوسری ٹیم روانہ کی گئی۔ اس نے شام کے پانچ بجے یہ خبر سنائی کہ دونوں گاڑیوں کے پرخچے اڑ گئے ہیں۔ مرنے والوں کی لاشیں پہچانی نہیں جاتیں۔ طاقت ور بموں سے انہیں تباہ کیا گیا ہے۔ خالدہ کے ساتھ جو باڈی بلڈر ہے' وہ یقیناً خطرناک گوریلا فائٹر ہوگا۔ آئندہ اسے گھیرنے کے لئے ٹھوس منصوبے اور محتاط عمل کی ضرورت ہے۔

دہشت گردوں کے ایک لیڈر نے غصے سے کہا۔ "مسٹر ریاست! تم نے پہلے کیوں نہ بتایا کہ اس عورت کے پاس یا اس کے یار کے پاس خطرناک ہتھیار ہیں؟"

ریاست نے کہا۔ "میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ خطرناک ہتھیاروں کے ساتھ ایک خطرناک فائٹر کو باڈی گارڈ بنالے گی۔"

"میرے آدمی شہروں میں فائرنگ کرتے ہوئے گزرتے ہیں لیکن نہ کبھی مارے جاتے ہیں' نہ پکڑے جاتے ہیں۔ تمہاری ایک عورت کے پیچھے میرے سات آدمی ایک ہی دم میں مارے گئے۔ کیا تم میرا اتنا بڑا نقصان پورا کرسکو گے؟"

"تم سات آدمیوں کے مرنے پر غصہ دکھا رہے ہو۔ اُدھر سینکڑوں شہری مارے جاتے ہیں۔ ان کے عزیز واقارب کے غم وغصے کا کیا عالم ہوگا؟ تم لوگوں کے پاس دنیا جہان

کے جدید ترین ہتھیار ہوتے ہیں لیکن کوئی شہری صرف ایک ہتھیار لے کر مقابلہ پر آجائے تو تم بھاگ جاتے ہو یا بھاگتے بھاگتے گولیوں کا نشانہ بن جاتے ہو۔ اگر تمام شہریوں کو تمہاری یہ بزدلی اور کمزوری معلوم ہوجائے تو تم لوگ شہر کے کسی راستے سے گزر نہیں سکو گے۔ تمہاری تمام طاقت ہتھیاروں کے بل پر ہے۔ اگر حکومت پولیس کو گھر میں بٹھا کر شہریوں کو ہتھیار دے کر ایک تجربہ کرے تو تم میں سے کسی کا نام و نشان تک نہیں رہے گا۔"

لیڈر نے غصے سے ریاست کا گریبان پکڑ کر کہا۔ "اے' تم کیا بکواس کررہے ہو؟"

اس نے گریبان چھڑاتے ہوئے کہا۔ "تم اپنے سات آدمیوں کا نقصان مجھ سے پورا کرنا چاہتے ہو جب کہ میرا نقصان ہوا ہے۔ نہ وہ باڈی بلڈر مارا گیا ہے' نہ خالدہ کو اغوا کیا گیا ہے' تم نے پیشگی پندرہ ہزار روپے لئے اور ایک پیسے کا کام نہیں کیا۔ الٹا مجھ پر دھونس جماتے ہو۔ اگر کام نہیں کرسکتے تو صاف کہہ دو۔ آج ہماری اس اندھیر نگری میں دہشت گردوں اور قاتلوں کی کمی نہیں ہے۔ میں کسی اور سے کام لے لوں گا۔ تم نہ سہی اور سہی' اور نہ سہی اور سہی۔"

لیڈر نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور سوچا۔ آج کل آدمی کتے بلی کی طرح مارے جاتے ہیں۔ میرے بھی آدمی مارے گئے تو کیا ہوا۔ دہشت گردی ہمارا پیشہ ہے۔ غیر ملکی ایجنٹ ہمیں لاکھوں روپے دیتے ہیں۔ ریاست علی ہم سے کام نہ کرائے تب بھی ہمیں تخریب کاری کا مظاہرہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ ایسے میں ریاست علی سے بھی پچیس پچاس ہزار مل رہے ہیں تو کیا برا ہے؟

وہ نرم پڑتے ہوئے بولا۔ "مسٹر ریاست! ہمیں آپس میں جھگڑا نہیں کرنا چاہئے۔ ورنہ دونوں پولیس کے مخبر بن کر ایک دوسرے کی نشاندہی کریں گے پھر دونوں ہی جیل جائیں گے۔ میرے اتنے آدمی مارے گئے ہیں۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں: معاوضہ کچھ بڑھا دو۔ آج رات کسی وقت بھی وہ باڈی بلڈر مارا جائے گا اور تمہاری عورت کو خفیہ اڈے پر پہنچا دیا جائے گا۔"

"اچھی بات ہے.......... کام ہونے پر دس ہزار زیادہ دوں گا۔"

ٹرانسمیٹر سے اشارہ ملنے لگا۔ لیڈر نے اسے آپریٹ کیا۔ دوسری طرف سے اطلاع

دینے والے نے کہا۔ "وہ جس کچے راستے پر جارہے ہیں' وہ راستہ آگے جاکر دو حصوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔ ان کا تعاقب اور نگرانی کرنے کے لئے زیادہ آدمیوں کی ضرورت ہے' کم از کم ایک درجن مسلح آدمیوں کو روانہ کریں۔ ویسے گمان غالب ہے کہ وہ جھیل والے راستے پر جائیں گے اور رات جھیل کے کنارے ہی گزاریں گے۔"

☆======☆======☆

وہ رات کے نو بجے جھیل کے قریب پہنچ گئے۔ وہاں دور دور تک بجلی کی روشنی تھی۔ جہاں روشنی نہیں تھی' وہاں دور تک تاریکی بھی تھی۔ اس اندھیرے اجالے کے درمیان وہ جھیل نہایت پُراسرار اور رومان پرور ہوگئی تھی۔ خالدہ نے کہا۔ "کتنی پُرسکون جگہ ہے۔ شہر کے ہنگاموں میں رہ کر یقین نہیں آتا کہ دنیا میں ایسی پُرامن اور پُرسکون جگہ بھی ہے۔ ہم یہیں قیام کریں گے۔"

سرور نے گھنے درختوں کے سائے میں گاڑی روک دی۔ وہاں سے کافی فاصلے پر چھوٹے چھوٹے کاٹیج بنے ہوئے تھے۔ وہاں سے گزرنے والے مسافران کاٹیجوں میں قیام کرتے تھے اور اس کا معقول کرایہ ادا کرتے تھے۔ سرور نے کہا۔ "یہاں رات گزارنے کے لئے کاٹیج ہیں پھر خیمے کا سامان لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ بولی۔ "اگر راستہ میں ہم پر حملہ نہ ہوتا اور وقت ضائع نہ ہوتا تو ہم شام سے پہلے ہی اس جھیل کے کنارے سے گزر جاتے' آگے جاکر پتا نہیں کہاں رات ہوتی اور کہاں خیمے کی ضرورت پڑ جاتی۔ پھر یہ کہ ہم جس کیمپ میں جارہے ہیں وہاں خیموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا تم کاٹیج میں رہنا چاہتے ہو؟"

"میرا خیال ہے ہم کاٹیج میں زیادہ محفوظ رہیں گے۔ وہاں مسلح چوکیدار ہوں گے۔"

"وہ ہم سے زیادہ مسلح نہیں ہوں گے۔ ان کاٹیجوں میں بیوی بچوں والے مسافر ہوں گے۔ اگر کسی وقت دشمنوں نے مجھ پر حملہ کیا تو فائرنگ سے ان بے چارے مسافروں کو جانی نقصان پہنچے گا۔"

"کمال ہے۔ دشمنوں کے دوبارہ حملے کا یقین ہے' اس کے باوجود ویرانے میں رات گزارنا چاہتی ہو۔"

"بھائی سلطان بیگ نے جو مشورہ دیا ہے' اس پر عمل کر رہی ہوں۔ میں اپنے بہلو

کے قاتلوں کو بے نقاب کرنے کے لئے ان کے ہر مشورے پر عمل کرتی رہوں گی۔ تم چاہو تو کاٹیج میں جاکر رات گزار سکتے ہو۔"

"تم طعنے دے رہی ہو مگر عقل سے سوچا جائے تو مجھے کاٹیج میں جانا چاہئے۔ یہاں رہ کر میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا میں بلیک بیلٹ ہولڈر ہوں۔ مقابلے پر آنے والوں کو جوڈو کراٹے کے ذریعے زیر کرسکتا ہوں لیکن یہاں تو بلاسٹنگ گن اور کلاشنکوف کے ذریعے جنگ ہوگی۔ میں نے آج تک ایک ریوالور سے بھی گولی نہیں چلائی۔ میں تمہارے لئے پریشانی کا باعث بن جاؤں گا۔ تمہیں دشمنوں سے مقابلہ کرتے وقت اپنی بھی حفاظت کرنی ہوگی اور میری بھی۔ میں یہاں رہ کر تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔"

خالدہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اسے تنہا چھوڑ کر جاسکتا ہے۔ وہ بولی۔ "مجھے دشمنوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر جاؤ گے۔ کیا یہ تمہاری مردانگی ہے؟"

"میں ایک تماشائی کی طرح تمہیں تنہا مقابلہ کرتے دیکھوں گا تو کیا وہ میری مردانگی ہوگی؟ بہتر ہے مجھے طعنے نہ دو۔ جتنی جلدی ہوسکے مجھے بندوق چلانا سکھا دو۔"

"بندوق چلانا آسان ہے لیکن صحیح نشانہ بازی کے لئے ایک عرصہ تک مشق جاری رکھنی پڑتی ہے۔ پتا نہیں دشمن کس وقت سر پر آپہنچیں۔ کیا تم اتنی جلدی کسی ٹارگٹ پر صحیح نشانہ لگانا سیکھ لوگے؟"

"جب تم کہتی ہو کہ اس کے لئے ایک عرصہ درکار ہے تو پھر کیسے سیکھ سکتا ہوں؟ اور جب سیکھنا ممکن نہیں ہے تو یہاں رہ کر کیا کرسکتا ہوں؟"

"پتھر اٹھا کر کسی کو مار تو سکتے ہو۔"

"واہ' کیا خوب کہتی ہو۔ تم عورت ہو کر خطرناک بلاسٹنگ گن سے فائرنگ کرو اور میں مرد ہو کر پتھر ماروں۔ کیا تم میری انسلٹ کرنے اپنے ساتھ لائی ہو؟"

خالدہ نے بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکالا۔ اس میں سائیلنسر لگایا۔ اپنی کمر سے کارتوس کی پٹی کھول کر دی پھر کہا۔ "میں گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن کرتی ہوں۔ تمہیں روشنی میں جتنے درخت نظر آئیں گے' ان کے تنوں پر گولی چلاؤ۔ میں تمہیں ریوالور کے بعد رائفل دوں گی۔"

سرور نے ریوالور اور کارتوس لے لئے۔ خالدہ نے ہیڈ لائٹس آن کردیں۔ سامنے

کتنے ہی موٹے موٹے تنے والے درخت تھے۔ کوئی بھی اناڑی ذرا سی کوشش سے صحیح نشانہ لگاسکتا تھا۔ سرور کا ایک نشانہ خطا ہوا۔ دو نشانے درست ہوئے۔ خالدہ نے کہا۔
"شاباش۔"

شاباشی ملنے کے بعد کئی نشانے خطا ہوئے۔ وہ مایوس ہو کر بولی۔ "یہ کیا کر رہے ہو۔ ریوالور کی مکھی سے ٹارگٹ کو ملاؤ۔"

اس نے ہدایت پر عمل کیا۔ ریوالور کی مکھی سے ٹارگٹ کو ملایا پھر گولی چلادی۔ دوسرے ہی لمحے کسی کی چیخ سنائی دی۔ درخت کے پیچھے والی جھاڑی میں کوئی گرا۔ وہ جھاڑی ذرا دیر تک ہلتی رہی۔ خالدہ چیخ سنتے ہی بلاسٹنگ گن لے کر گاڑی سے نکل آئی تھی۔ پھر تاریکی میں دوڑتی ہوئی ایک درخت کے پیچھے چلی گئی تھی۔ وہاں سے سرور نظر نہیں آرہا تھا۔ پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔

وہ دس منٹ تک خاموشی سے کھڑی رہی۔ محتاط نظروں سے دائیں بائیں دیکھتی رہی۔ پیچھے گہری جھیل تھی۔ دشمن اُدھر سے نہیں آسکتے تھے اور سامنے سے کوئی نہیں آرہا تھا۔ اس آخری چیخ کے بعد گہرے سناٹے میں کسی کے قدموں کی آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید آنے والا تنہا تھا۔ شاید وہ دشمن نہیں تھا۔ کوئی بھٹکا ہوا مسافر ایک اناڑی کی فائرنگ سے ہلاک ہوگیا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "سرور! تم کہاں ہو؟"

اسے جواب نہیں ملا۔ وہ ایک درخت سے دوسرے درخت کے پیچھے جاتے ہوئے اسے پکارتی رہی پھر اس درخت کے پاس آگئی جس کے پیچھے جھاڑیوں میں کوئی اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ کافی وقت گزر چکا تھا۔ اس مردے کا کوئی حمایتی نظر نہیں آیا تھا اور نہ ہی کسی نے چھپ کر جوابی فائرنگ کی تھی۔ خالدہ نے قریب آکر لاش کی ایک ٹانگ پکڑی۔ اسے جھاڑی سے باہر کھینچا۔ بے چارہ نہتا تھا۔ خواہ مخواہ مارا گیا تھا۔ اس کے لئے سرور کو الزام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ وہ تو ویرانہ سمجھ کر مشق کر رہا تھا۔

وہ لاش کے پاس سے اٹھنا چاہتی تھی' اسی وقت ہلکی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ اس نے چونک کر آس پاس دیکھا پھر پتا چلا وہ آواز لاش کے پاس سے آرہی تھی۔ اس نے جلدی سے تلاشی لی تو اندرونی جیب سے ایک ٹرانسمیٹر برآمد ہوا۔ اس کا سرخ بلب جلتا بجھتا جارہا تھا۔ خالدہ نے اسے آن کیا۔ دوسری طرف سے کوئی کہہ رہا تھا۔ "ہیلو ہیلو

چنگیزی! ہیلو ہیلو۔"

بولنے والا کوئی پیغام دینا چاہتا تھا یا کوئی اہم اطلاع حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن جب تک ہیلو ہیلو کا جواب نہ ملتا' بات آگے بڑھنے والی نہیں تھی۔ خالدہ نے کچھ سوچ کر جھاری کو زور زور سے ہلایا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "ہیلو ہیلو میں سخت تکلیف میں ہوں۔ درخت پر چڑھا ہوا تھا' جھاڑی میں گر پڑا ہوں۔ ہیلو ہیلو۔"

دوسری طرف جھاڑیوں کے ہلنے کی آواز آرہی تھی۔ بولنے والے کی صحیح آواز کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ ادھر سے پوچھا گیا۔ "ان دونوں کی پوزیشن بتاؤ۔"

"وہ جھیل کے کنارے کاٹیجوں سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر ہیں۔ شاید یہیں رات گزاریں گے۔"

"او کے ہمارے پہنچنے تک ان پر نظر رکھو۔ کوئی خاص بات ہو تو رابطہ کرنا۔"

دوسری طرف سے رابطہ ختم ہوگیا۔ خالدہ نے ایک گہری سانس لے کر زیرِلب کہا۔ "سرور کا نشانہ درست تھا۔ میں ہی غلط سمجھ رہی تھی۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ چاروں طرف گھوم گھوم کر آواز دینے لگی۔ "سرور تم کہاں ہو' آجاؤ۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ تم نے ایک دشمن کو مارا ہے۔ چھپنے کی ضرورت نہیں چلے آؤ۔"

وہ انتظار کرنے لگی۔ رات کی تاریکی اور سناٹے میں جھیل کی لہریں ہلکی ہلکی سرگم سنا رہی تھیں۔ جھینگر بھی بول رہے تھے۔ جس کا انتظار تھا' وہ نہیں بول رہا تھا۔ پتا نہیں کہاں گم ہوگیا تھا۔ شاید کاٹیجوں کی طرف چلا گیا تھا۔

یہ سوچ کر غصہ آنے لگا' بھلا یہ کوئی مردانگی ہے۔ ساڑھے چھ فٹ لمبے تڑنگے جوان کو بندوق چلانی نہیں آتی' کوئی بات نہیں۔ وہ اگر خالی بندوق لے کر کھڑا ہوجائے تو دشمن بھاگ جائیں مگر وہ خود بھاگ گیا ہے۔

وہ مایوس ہو کر گاڑی کے پاس آئی۔ اس کی ہیڈ لائٹس کو بجھا دیا۔ گہری تاریکی میں وہ اپنا دل پکڑ کر رہ گئی۔ وہ روشنی میں اعتراف نہیں کرسکتی تھی۔ اندھیرے میں مان رہی تھی کہ اسے چاہنے لگی ہے۔ اسی لئے اس کے جانے پر دل دکھ رہا تھا۔ کوئی غیر ایسی حالت میں بے یارومددگار چھوڑ جائے تو شکایت نہیں ہوتی۔ شکایت اپنوں سے ہوتی ہے۔ اس

کے جانے کے بعد پتا چلا کہ اسے اپنا سمجھنے لگی تھی۔

اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر سوچا۔ "اچھا ہوا میں نے دوسری شادی نہیں کی۔ میری زندگی میں جو بھی آئے گا' دولت دیکھ کر آئے گا یا ایسا ہی کوئی بزدل باڈی بلڈر ہوگا جو برے وقت میں ساتھ چھوڑ جائے گا۔ یہ کم بخت جوانی دیوانی ہے۔ میں ایک عرصے بعد اسے دیکھ کر دیوانی ہوگئی تھی۔ اب سنبھل کر رہوں گی۔

وہ سوچتے سوچتے چونک گئی۔ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اسے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ اس نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ ناراضگی بھول کر خوشی سے بولی۔
"سرور! تم آگئے؟ کہاں چلے گئے تھے؟"

اسے سلطان بیگ کی آواز سنائی دی۔ "خالدہ! کیا اب تک تم نے یہی ٹریننگ حاصل کی ہے؟ میری جگہ کوئی دشمن ہوتا تو اس کی گولی تمہیں ختم کر چکی ہوگی۔"

اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ کچھ سوچے سمجھے بغیر جذباتی انداز میں باہر نکل آئی تھی۔ آنے والوں کی آواز قریب آرہی تھی۔ ایس پی سلطان بیگ کے ساتھ چار مسلح سپاہی تھے۔ اس نے پوچھا۔ "کیا سرور تمہارے ساتھ نہیں ہے؟"

وہ بولی۔ "نہیں۔ وہ کاٹیج میں رات گزارنے گیا ہے۔"

سلطان بیگ نے کہا۔ "میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ کاٹیج میں تھا۔ وہاں سرور نہیں ہے۔ آخر بات کیا ہوگئی؟ وہ تمہیں چھوڑ کر کہاں گیا ہے؟"

"میں کیا بتاؤں۔ سیدھی سی بات یہی سمجھ میں آتی ہے' اسے اپنی جان عزیز ہے۔ ہمارے ساتھ رہ کر خواہ مخواہ مرنا نہیں چاہتا۔ اسی لئے چلا گیا۔"

"میں نہیں مانتا۔ اسے مرنے کا خوف ہوتا تو گابے جی اور جیلر کو کبھی گرفتار نہ کراتا۔ وہ کچھ سوچ سمجھ کر ہی کہیں گیا ہے' بائی دی وے' ہم نے کسی کی چیخ سنی تھی۔ کیا کسی دشمن سے سامنا ہوا تھا؟"

خالدہ انہیں لاش کے پاس لے گئی۔ پھر مختصر روداد سنائی کہ وہ سرور کے اناڑی پن سے مارا گیا ہے اور ٹرانسمیٹر پر ہونے والی گفتگو سے معلوم ہو چکا ہے کہ دشمن یہاں پہنچنے والے ہیں۔ سلطان بیگ نے کہا۔ "تم گاڑی میں رہو۔ ہم ان گھنے درختوں میں جا کر چھپے رہیں گے۔ دشمنوں پر فائرنگ نہ کرنا۔ انہیں قریب آنے کا موقع دینا تاکہ ہم انہیں پہچان

سکیں۔"

پھر وہ چاروں طرف ٹارچ لائٹ کی روشنی میں درختوں کو دیکھتے ہوئے ایک ایک درخت پر ایک ایک سپاہی کو چڑھنے کا حکم دینے لگا۔ آخر میں وہ گاڑی کے قریب والے درخت پر خود چڑھ گیا۔ ایک شاخ پر پہنچ کر بولا۔ "میں یہاں سے دور تک نہیں دیکھ سکتا اور بار بار ٹارچ بھی روشن نہیں کر سکتا۔ بہرحال تم نظر آتی رہو گی۔"

"میں گاڑی میں نہیں رہوں گی۔ یہاں کی کھلی فضا میں اچھا لگ رہا ہے۔ میں جھیل کے کنارے جا رہی ہوں۔"

اس نے بلاسٹنگ گن کو شانے پر رکھا پھر آرام سے ٹہلتی ہوئی جھیل کے کنارے ایک بڑے پتھر پر آکر بیٹھ گئی۔ یہ ویرانی اور سناٹا اب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ سرور کی موجودگی میں یہی ماحول رومانی لگ رہا تھا۔ وقت اور مزاج اور سوچنے کا انداز پلک جھپکتے ہی بدل جاتا ہے اور اسے آدمی ہی بدلتا ہے۔

وہ جانے والے کے متعلق کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ حاضر دماغ رہ کر دشمنوں کا انتظار کرنا چاہتی تھی۔ مگر نادان بھول گئی تھی کہ جھیل کے کنارے محبوب کا ہی انتظار ہوتا ہے۔ ہاتھوں میں بندوق پکڑنے کے باوجود دل اپنے ہی معاملے میں الجھتا رہتا ہے۔ اس الجھن میں یہ دھیان نہیں رہا کہ دشمن گہری جھیل میں اندر ہی اندر تیرتے ہوئے آسکتے ہیں۔

وہ دونوں تیرتے ہوئے اس پتھر کے پیچھے آئے جس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ وہ جیسے ہی پانی سے ابھر کر ساحل پر آئے' رات کی گہری تاریکی میں ٹھائیں کی آواز دور تک گونجتی گئی۔ پانی سے ابھرنے والے کی ایک چیخ نکلی۔ دوسری ٹھائیں کی آواز کے ساتھ دوسرا بھی چیخ مار کر اچھلا پھر زمین پر گر کر ٹھنڈا ہوگیا۔

خالدہ پہلی ہی فائرنگ میں چونک کر جھیل کی طرف گھوم گئی تھی۔ سلطان بیگ اور سپاہیوں نے درختوں کے اوپر ہی سے چاروں طرف اندھا دھند فائرنگ کی۔ ان کا خیال تھا کہ اندھیرے میں چھپ کر آنے والے دشمن گولیوں کی زد میں آئیں گے۔ خیال کسی حد تک درست تھا۔ دو چار چیخیں سنائی دیں اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ وہ سب درختوں سے کود کر نیچے آگئے۔ اسی وقت جوابی فائرنگ میں دو سپاہی مارے گئے۔ سلطان بیگ کی

کراہ سنائی دی۔ وہ زخمی ہوگیا تھا۔ کسی نے للکار کر کہا۔ "مسٹر ایس پی! ہم نے تمہیں درختوں پر چڑھتے دیکھ لیا تھا۔ اب تمہارے دو سپاہی مارے گئے ہیں۔ تم شاید ابھی تک زندہ ہو مگر بیکار ہو چکے ہو۔ باقی دو سپاہیوں کو حکم دو' وہ ہتھیار پھینک دیں۔"

خالدہ نے بولنے والے کی آواز سے سمت کا اندازہ کیا پھر ٹرائیگر دبا دیا۔ درختوں کے جھنڈ میں ایک زبردست دھماکا ہوا اس کے ساتھ ہی کئی چیخیں سنائی دیں لیکن دوسری بار وہ فائر نہ کر سکی۔ جھیل کے پانی سے پھر دو دشمن ابھر کر آئے تھے۔ دونوں نے بیک وقت چھلانگ لگا کر خالدہ کو دبوچ لیا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ ان کے ساتھ گر پڑی۔ ان کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔ دونوں سپاہی ان پر فائر نہیں کر سکتے تھے۔ گولیاں خالدہ کو بھی لگ سکتی تھیں۔ آخر کار وہ بے بس ہوگئی۔ اس کے ہاتھوں سے بلاسٹنگ گن چھین لی گئی۔ دوسرے شخص نے چیخ کر کہا۔ "ہم سپاہیوں کو حکم دیتے ہیں کہ سامنے آکر ہتھیار ڈال دو' ورنہ تمہارے ایس پی کی منہ بولی بہن ماری جائے گی۔"

سلطان بیگ کراہتے ہوئے بیٹھ گیا۔ اپنے زخمی شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "ہتھیار پھینک دو۔ یہ جیسا کہتے ہیں' ویسا کرو۔"

سپاہیوں نے آگے بڑھ کر ہتھیار پھینک دیے۔ ایک شخص' سلطان بیگ کو سہارا دے کر جھیل کے کنارے اسی پتھر کے پاس لے آیا۔ جہاں خالدہ کو قابو کیا گیا تھا۔ ایسے ہی وقت ریاست علی کا قہقہہ سنائی دیا۔ گھنے درختوں کے سائے میں گہری تاریکی تھی۔ وہ تاریکی سے نکل کر خالدہ اور سلطان بیگ کی طرف آرہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "درختوں پر سے جتنی گولیاں چلائیں' ان سے ہمارا ایک آدمی بھی نہیں مرا۔ ہم نے جھوٹ موٹ چیخ کر اپنی موت کا یقین دلایا تھا۔ البتہ جھیل سے آنے والے دو آدمی مارے گئے۔ وہ ہمارے اہم آدمی تھے۔"

دہشت گردوں کے لیڈر نے کہا۔ "میں اپنے آدمیوں کا بدلہ لوں گا۔ بتاؤ تم میں سے کس نے انہیں مارا ہے؟"

دونوں سپاہیوں نے قسم کھا کر کہا انہوں نے گولیاں نہیں چلائی تھیں۔ سلطان بیگ نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے' مجھے ان پر گولیاں چلانے کا موقع نہیں ملا۔ میرے دو سپاہی جو مارے گئے ہیں' وہ میرے قریب ہی تھے۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ انہوں نے بھی

تمہارے آدمیوں کو نہیں مارا ہے۔"

خالدہ کا دل اچانک ہی خوشی سے دھڑکنے لگا۔ اگر بھائی سلطان بیگ اور ان کے سپاہیوں نے گولیاں نہیں چلائیں تھیں تو صاف ظاہر تھا' سرور نے ہی جھیل سے آنے والوں کو گولی ماری ہوگی۔ ریاست علی نے چونک کر کہا۔ "ہم خالدہ کے باڈی بلڈر ساتھی کو بھول رہے ہیں۔ بولو خالدہ! وہ کہاں ہے؟"

وہ بولی۔ "خدا بہتر جانتا ہے' ہم نہیں جانتے' وہ کہاں ہے مگر آج تمہاری اصلیت سامنے آگئی ہے۔ اب تم قانون کے پھندے سے بچ نہیں سکو گے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "پھنسنے کا خوف ہوتا تو یوں سامنے نہ آتا۔ اب یہاں سے تمہارا یہ ایس پی بھائی زندہ نہیں جائے گا۔ بے چارے دونوں سپاہی بھی مفت میں مارے جائیں گے۔ میں تمہیں ایسی جگہ لے جا کر رکھوں گا جہاں قانون کے کتے بو سونگھتے ہوئے نہیں پہنچ سکیں گے۔"

خالدہ نے پوچھا۔ "کیا تم سمجھتے ہو' مجھے قیدی بنا کر میری دولت پر قبضہ جما سکو گے؟"

"تم صرف قیدی نہیں رہو گی۔ میری بیوی بھی بنو گی۔ یہ فیصلہ تم پر ہوگا کہ راضی خوشی بنو گی یا جبر و تشدد سے ہار مانو گی۔ تم ہر حال میں جائیداد کا ایک وارث پیدا کرو گی۔"

"میں تم پر تھوکتی ہوں۔ میں کبھی شادی نہیں کروں گی کبھی ماں نہیں بنوں گی۔ تم مجھ پر کب تک ظلم کرو گے۔ میں جبراً ماں بننے سے پہلے خودکشی کر لوں گی۔"

"تمہیں اس کا موقع ہی نہیں دیا جائے گا۔ بہرحال یہاں بحث کرنا مناسب نہیں ہے۔ ایس پی اور سپاہیوں کو ختم کرو اور میری ہونے والی شریکِ حیات کو لے چلو۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی حلق سے چیخ نکلی۔ کسی نے گولی چلائی تھی۔ وہ گولی ٹانگ میں لگی تھی۔ دوسروں کو سنبھلنے کا بہت کم موقع ملا۔ کیونکہ پے درپے فائرنگ ہو رہی تھی۔ فائرنگ کرنے والا فاسٹسٹ گن شوٹر تھا۔ اِدھر اُدھر بھاگ کر درختوں کی آڑ میں جانے سے پہلے ہی وہ گولیاں کھا رہے تھے اور گر رہے تھے۔ سپاہیوں نے بھی پھینکے ہوئے ہتھیار اٹھا لئے تھے اور بھاگنے والوں پر گولیاں برسا رہے تھے ایسے میں کون بچ سکتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میدان صاف ہوگیا۔ تمام دشمن ہمیشہ کے لئے ٹھنڈے پڑ گئے۔ صرف ریاست علی زمین پر پڑا زخمی ٹانگ کو پکڑے کراہ رہا تھا۔

خالدہ گم صم کھڑی ہوئی تھی۔ زمین پر پڑی ہوئی بلاسٹنگ گن اٹھانا بھول گئی تھی۔ اس کا دھڑکتا ہوا دل کہہ رہا تھا۔ خدا کرے یہ ڈرامائی انداز میں مدد کرنے والا سرور ہی ہو اور بھلا ہو بھی کون سکتا تھا؟ وہاں اپنوں میں ایک وہی مددگار رہ گیا تھا۔

سلطان بیگ نے کراہتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔ "سرور! سامنے آجاؤ' مجھے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ مگر آواز سنا کر آنا۔ ورنہ سپاہی گولیاں چلائیں گے۔"

اس کی آواز سنائی دی۔ "میں آرہا ہوں۔ گولیاں نہ چلانا۔"

گھنے درختوں کے درمیان شاخوں کے ہلنے اور پتوں کے شور مچانے کی آواز آئی۔ پھر وہ کود کر دھپ سے گھاس پر آیا۔ ابھی تاریکی میں نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا درختوں کے سائے سے نکل کر خالدہ کی طرف آرہا تھا۔ چند لمحے پہلے ہی جھیل کے اس پار زرد چاند طلوع ہو گیا تھا۔ اس کی دھندلی سی زرد روشنی میں وہ پہاڑ کلاشنکوف اٹھائے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ خالدہ ایک دم سے پھٹ پڑی۔ "تم جھوٹے بے ایمان ہو' دھوکے باز ہو تم نے مجھے بہت ستایا ہے۔ بہت پریشان کیا ہے۔ میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔"

وہ دوسری طرف منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ پھر بولا۔ "مجھے صورت دکھانے کا شوق نہیں ہے۔"

وہ دوڑتی ہوئی آئی پھر اس کی پیٹھ پر گھونسے مارتے ہوئے کہنے لگی۔ "تم نے بہت پہلے جھوٹ کہا۔ ڈرائیونگ نہیں آتی پھر ایکسپرٹ کی طرح گاڑی ڈرائیو کرنے لگے۔ اس کے بعد کہا۔ کبھی تم نے بندوق نہیں پکڑی۔ مجھ سے رائفل شوٹنگ سیکھ رہے تھے۔ مجھے الو بنا رہے تھے۔ بولو اب یہ کلاشنکوف کہاں سے لے آئے ہو؟"

"یہ کلاشنکوف اسی شخص کی ہے جسے تم نے جھاڑیوں میں مردہ پڑا دیکھا تھا۔ وہ میرے ہاتھوں مرنے سے پہلے مجھے نشانہ بنا رہا تھا۔ میں نے اسے نشانہ بنالیا تو تم غصہ دکھا رہی ہو۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ تمہارا رشتے دار ہے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ حالانکہ اس نے لطیفہ نہیں سنایا تھا۔ مگر وہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ بہت دیر سے اس کے اندر مسرتیں مچل رہی تھیں۔ وہ پہاڑ کے بازوؤں میں جھوم جھوم کر قہقہے لگانا چاہتی تھی۔ چونکہ اس کا موقع نہیں مل سکتا تھا اور اس کی بیوگی بھی اتنی آزادی

نہیں دے سکتی تھی' اس لئے خواہ مخواہ اسے غصہ دکھا رہی تھی۔

ایک سپاہی گاڑی سے فرسٹ ایڈ کا سامان لے آیا تھا۔ سلطان بیگ اور ریاست علی کی مرہم پٹی ہو رہی تھی۔ خالدہ نے ریاست کے منہ پر ایک ٹھوکر ماری پھر دوسری ٹھوکر مارنا چاہتی تھی۔ سرور نے اس کے بازو کو پکڑ کر کھینچ لیا پھر کہا۔ "ایک بے بس زخمی کو مارنا مناسب نہیں ہے۔"

وہ بولی۔ "یہ مجھے اغوا کرنے آیا تھا۔ میرے لئے کتنی گندی باتیں کر رہا تھا۔ کیا میں عورت نہیں ہوں' ایک مشین ہوں جس سے یہ کم ظرف لوگ وارث پیدا کرانا چاہتے ہیں۔"

وہ بول رہی تھی۔ اس نے سرور کی گرفت سے بازو نہیں چھڑایا۔ حالانکہ تکلیف ہو رہی تھی۔ شیر کے پنجے جیسی پھیلی ہوئی ہتھیلی نے اسے بری طرح جکڑ لیا تھا۔ پتا نہیں کیوں بعض حالات میں مرد بری طرح پیش آئے تو برا نہیں لگتا۔ کچھ زیادہ ہی اچھا لگتا ہے۔

سلطان بیگ نے کہا۔ "ریاست! تمہیں بڑا ناز تھا کہ ہم تمہیں بے نقاب نہیں کر سکیں گے۔ اب کیا خیال ہے؟ تم پر ایک نہیں کئی الزامات عائد کئے جاسکتے ہیں۔ تم نے بڑے بھائی کی دولت پر ہاتھ صاف کرنے کے لئے بلو کو ہلاک کرایا۔ خالدہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی۔ ان دہشت پسندوں کی لاشیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ تم تخریب کاروں کے بہت بڑے گروہ سے تعلق رکھتے ہو۔"

وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "میرا تعلق کسی گروہ سے نہیں ہے۔ میں ایک شریف خاندان کا فرد ہوں۔ اپنے بھائی کی بیوہ کو اس باڈی بلڈر کے ساتھ رنگ رلیاں منانے سے روکنا چاہتا ہوں' اس لئے تم لوگ مجھ پر جھوٹے الزامات لگا رہے ہو۔ میں بلو کا قاتل نہیں ہوں۔ تم مجھ پر الزامات لگا سکتے ہو لیکن ثابت نہیں کرسکتے۔ ثبوت پیش کرنے اور وعدہ معاف گواہ بنانے کے لئے یہاں کوئی دہشت گرد زندہ نہیں ہے۔"

وہ درست کہہ رہا تھا۔ اگرچہ وہ بے نقاب ہوگیا تھا۔ آئندہ اس کی کڑی نگرانی کی جاسکتی تھی۔ اس کی چالوں کو ناکام بنایا جاسکتا تھا لیکن اس ویرانے سے شہر لے جاکر یہ ثابت کرنا دشوار ہوتا کہ وہ دہشت گردوں سے تعلق رکھتا ہے یا ان سے معاوضے پر کام

لیتا ہے۔ وہ خالدہ کے رشتے دار کی حیثیت سے بھی یہی بیان دیتا کہ خالدہ کی عزت رکھنے کے لئے وہ خالدہ کو رنگ رلیوں سے باز رکھنا چاہتا تھا' اسی لئے تعاقب کرتا ہوا اس جھیل تک پہنچا تھا۔

سرور نے کہا۔ "اکثر بے گناہوں کو پھانس کر ان کے خلاف مضبوط کیس بنالیا جاتا ہے۔ تم تو پکے بدمعاش ہو ایس پی سلطان صاحب تمہیں قانون کی گرفت سے نکلنے نہیں دیں گے۔"

سلطان بیگ نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ "اس شیطان کے خلاف کوئی مضبوط کیس بنانا ہی ہوگا۔ اگر یہ حوالات میں پہنچے گا تو ضمانت پر رہا ہوجائے گا پھر مجھے اوپر سے احکامات ملیں گے کہ اس شیطان کی فائل عالی جناب کے دفتر بھیج دی جائے۔ نہیں' میں اسے بچ نکلنے کا موقع نہیں دوں گا۔"

"میں چاہتی ہوں اسے حوالات میں نہ ڈالا جائے جس طرح یہ مجھے قیدی بنا کر رکھنا چاہتا تھا' اسی طرح ہم اسے خفیہ طور پر قید میں رکھیں گے۔"

سرور نے چٹکی بجا کر کہا۔ "گڈ آئیڈیا۔ اگر تم بھی منظرِ عام پر نہیں آؤ گی تو یہ الزام لگایا جائے گا کہ ریاست علی نے تمہیں اغوا کیا ہے۔"

خالدہ نے کہا۔ "ارے واہ' میرے اغوا ہونے کی بات پھیلے گی تو کیا میری بدنامی نہیں ہوگی؟"

"اگر میں دشمنوں کو ٹھکانے نہ لگاتا تو تم اغوا ہوچکی ہوتیں۔ تب حقیقتاً تمہاری بدنامی ہوتی۔ اب جھوٹ موٹ بدنام ہو کر تم عدالت میں بیان دے سکتی ہو کہ یہ تم سے ایک وارث پیدا کرانا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اس نے اصلی وارث ببلو کو قتل کرایا تھا۔ ایک اغوا ہونے والی عورت کے بیان کو درست تسلیم کیا جاتا ہے۔"

سلطان بیگ نے کہا۔ "تمہاری باتوں میں وزن ہے۔ شیطان کو سزا دلانے کے لئے شیطانی چال چلنی چاہئے۔"

"بھائی جان! کیا آپ بھی یہی چاہتے ہیں؟"

"تم میری بہن ہو۔ میں تمہاری بدنامی گوارا نہیں کروں گا لیکن دنیا والوں کے سامنے ریاست کا اصلی روپ ضرور لاؤں گا۔ معصوم ببلو کے اس بے رحم قاتل کو قانون

کے ذریعے سزا دلاؤں گا۔ فی الحال ہم اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر کیمپ میں پہنچائیں گے۔ وہاں پہنچنے تک شاید کوئی عمدہ سی تدبیر سجھائی دے اور ہم اسے بدترین قاتل ثابت کرسکیں۔"

دو سپاہیوں نے ریاست علی کو سہارا دے کر پولیس وین کی پچھلی سیٹ پر پہنچایا۔ خالدہ نے سلطان بیگ سے کہا۔ "آپ زخمی ہیں۔ میری گاڑی میں چلیں۔"

"مجھے مجرم کے ساتھ رہنا چاہئے۔ میں چاہتا ہوں' میری پولیس وین سرور ڈرائیو کرے۔ تم اپنی گاڑی میں ہمارے ساتھ چلتی رہو۔"

اس کے دل نے کہا۔ "سرور کو میری گاڑی میں ہونا چاہئے۔ میرے ساتھ رہنا چاہئے۔ میں کل دوپہر کو کیمپ پہنچنے تک تنہا نہیں رہ سکوں گی۔ اس کی کمی محسوس کرتی رہوں گی۔"

سلطان بیگ نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہی ہو؟"

وہ چونک کر بولی۔ "وہ.......... میں.......... میں تھکن محسوس کر رہی ہوں۔ مجھ سے اتنی لمبی ڈرائیونگ نہیں ہوسکے گی۔"

"میرا ایک سپاہی ڈرائیو کرے گا۔"

وہ پھر پریشان ہوگئی۔ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "ایک سپاہی سے کیا باتیں کروں گی۔ راستے بھر خاموش رہنا ہوگا۔"

سلطان بیگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "سرور سے دل بہل جائے گا۔"

وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔ "آ.......... آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔"

"میری دعا ہے کہ جو سمجھ رہا ہوں' وہ غلط نہ ہو۔ خالدہ! جتنی جلدی ہوسکے شادی کرلو۔ سرور کل سے یہ ثابت کرتا آرہا ہے کہ وہ تمہارے قابل ہے۔ وہ برے وقت میں تمہارا ساتھ چھوڑنے والا بندہ نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا' وہ تمہارے لئے کیا سوچتا ہے۔ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ تم دونوں کے ارادے ایک ہوئے تو دشمنوں کے ارادے خاک میں مل جائیں گے۔ تم اپنی گاڑی میں بیٹھو' میں سرور کو بھیج رہا ہوں۔"

وہ اسے گاڑی میں چھوڑ کر پولیس وین کے پاس آیا پھر بولا۔ "سرور! تمہیں خالدہ کے ساتھ رہنا چاہئے۔ وہ لانگ ڈرائیو کی عادی نہیں ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

وہ دونوں پولیس وین سے ذرا دور آئے۔ سلطان بیگ نے کہا۔ "مرد کو دو ٹوک بات کہنا چاہئے۔ لہٰذا میرے سوال کا فوراً سیدھا سا جواب دو۔ خالدہ کو شریکِ حیات بنا سکتے ہو؟"

وہ حیرانی سے بولا۔ "آپ بے موقع ایسی بات پوچھ رہے ہیں۔ آخر بات کیا ہے؟"

"تمہاری ایک ہاں سے خالدہ کو تحفظ حاصل ہوگا اور بلبو کا قاتل اپنی سزا کو پہنچے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"خالدہ ابھی بدنامی سے ڈرتی ہے۔ یہ نہیں چاہتی کہ اس کے اغوا ہونے کا ڈراما پلے کیا جائے۔ تم اس ڈرامے کے رازدار ہو۔ حقیقت جانتے ہو وہ سچ مچ اغوا نہیں کی جائے گی۔ اگر وہ ایک شریکِ حیات کی حیثیت سے تمہارے ساتھ کہیں چھپی رہے تو ریاست کو سزا دلانے کے بعد انکشاف ہوگا کہ اس سے اعتراف جرم کرانے کے لئے یہ سب کچھ کیا گیا تھا۔ ورنہ وہ دراصل شریکِ حیات کی حیثیت سے تمہارے ساتھ رہتی آئی ہے۔"

"آپ مجھے زندگی کا بہت اہم فیصلہ ایک لمحے میں کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔"

"چلو ایک لمحہ نہ سہی۔ آج ایک رات میں کرلو۔"

دونوں طرف دل کے معاملات پوشیدہ نہیں رہے تھے۔ خالدہ کا دل اس کے لئے مچلنے لگا تھا اور اس کا دل خالدہ کو مانگنے لگا تھا۔ وہ اپنی گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔ سرور اسٹیئرنگ سیٹ پر آگیا۔ پولیس وین چل پڑی تھی۔ اس نے بھی گاڑی آگے بڑھا دی۔ خالدہ نے پوچھا۔ "جب تمہیں چھپ کر رہنا تھا تو مجھے کیوں نہ بتایا۔ میں سمجھ رہی تھی، تم کالج میں گئے ہو، ویسے تم نے کمال کردیا۔ میں تمہاری صلاحیتوں کو مانتی ہوں۔ مگر آئندہ کبھی دھوکا نہ دینا۔"

"آئندہ وہ دھوکا دیتا ہے جس سے ساری زندگی کا ساتھ ہوتا ہے۔ پتا نہیں آگے جاکر کہاں ہمارا ساتھ ختم ہوجائے گا۔"

"ایسا کیوں سوچتے ہو؟ ہم ہمیشہ ساتھ رہ سکتے ہیں۔"

"ہمیشہ؟" اس نے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ نظریں چرانے لگی۔ سرور نے کہا۔ "یہ حیا کا تقاضا ہے۔ میں سمجھتا ہوں تم ایسی بات آنکھیں ملا کر نہیں کرو گی۔ نظریں جھکالو، میں سمجھ لوں گا۔"

اس کی نظریں بے اختیار جھک گئیں پھر وہ جلدی سے سر اٹھا کر بولی۔ "نن.........
نہیں شادی کرکے خود کو پابندیوں میں جکڑنا نہیں چاہتی۔"

"کیسی پابندی؟"

"یہی کہ ہر عورت بیوی بننے کے بعد ماں بننے کی پابند ہوتی ہے۔ میں بلبو کو پھر اس دنیا میں لاکر گولیوں سے چھلنی کرانا نہیں چاہتی۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ ایک المیہ جو ایک بار ہوچکا ہے، وہ بار بار نہیں ہوتا۔"

"کیا ہمارے شہروں میں ایک ہی المیہ بار بار نہیں ہو رہا ہے؟ مجھے بتاؤ کون سا راستہ، کون سی گلی محفوظ ہے، جہاں سے ہم مائیں اپنے بلبو کو اسکول پہنچا سکتی ہیں؟"

یہ اتنا اہم سوال تھا جس کا جواب پولیس اور انتظامیہ کے پاس نہیں تھا پھر بھلا سرور کیا جواب دیتا۔ وہ بڑی دیر تک خاموش رہ کر سوچتا رہا پھر بولا۔ "فی الحال تمہیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ تم ریاست سے بلبو کا انتقام لینا چاہتی ہو یا نہیں؟"

"جب میرا بچہ لہو میں ڈوبا ہوا میرے سینے سے لگا ہوا تھا تب ہی میں نے قسم کھائی تھی کہ قاتل کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

"تو پھر قسم پوری کرو۔ اس پر الزام آنے دو کہ اس نے تمہیں اغوا کیا ہے۔ رہ گئی بدنامی کی بات تو میں تمہیں بدنامی سے بچا سکتا ہوں بشرطیکہ ہم ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن جائیں۔ تمہارے بھائی سلطان صاحب کا یہی مشورہ ہے۔"

اس کا چہرہ ایک دم سے سرخ ہوگیا۔ یہ شرم وحیا کی نہیں غصے کی لالی تھی۔ وہ ایک دم سے بپھر کر بولی۔ "کیا بھائی صاحب نے مشورہ دیا ہے۔ کیا میں اتنی گری پڑی ہوں کہ تم کسی کے مشورے پر مجھ بے چاری سے ہمدردی کرو گے۔ مجھے محبت کی بھیک دو گے۔ میں اکیلی عورت چاروں طرف سے مصیبتوں میں گھری ہوئی ہوں تم اللہ کے نام پر شادی کرکے میری مدد کرو گے۔ تم اتنے بے حس ہو کہ کوئی دوسرا تمہیں میرے پاس بھیجتا ہے۔ تمہارے اپنے دل میں کچھ نہیں ہے کوئی احساس نہیں ہے، کوئی جذبہ نہیں ہے، تمہاری اپنی کوئی پسند کوئی چاہت نہیں ہے۔ خبردار! مجھ سے کوئی بات نہ کرنا۔ مجھے تمہاری آواز بھی زہر لگتی ہے۔ گاڑی روکو۔ میں کہتی ہوں گاڑی روکو تم اس وقت صرف ڈرائیور لگ رہے ہو اور میں کسی ڈرائیور کے ساتھ کبھی نہیں بیٹھتی۔ کیا تم نے سنا نہیں۔ گاڑی

روکو۔"

اس نے رفتار ذرا سست کی مگر گاڑی نہیں روکی۔ پولیس وین ان کے قریب سے گزرنے لگی۔ سرور نے کہا.......... "سلطان صاحب! آپ اپنی رفتار سے چلیں۔ ہم آرام سے آرہے ہیں آگے کسی آبادی میں ملاقات ہوگی۔"

پولیس وین تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔ خالدہ نے گھور کر پوچھا۔ "تم نے اس گاڑی کو آگے کیوں جانے دیا؟"

"تاکہ میں واپس جاسکوں۔" اس نے گاڑی روک کر کہا۔ "تم کسی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھنا نہیں چاہتیں اور میں ڈرائیور نہیں ہوں کہ تمہارے لئے گاڑی چلاتا رہوں۔ یہ رہی تمہاری گاڑی اور یہ رہی گاڑی کی چابی میں پیدل سینکڑوں میل چل کر اپنے شہر پہنچ سکتا ہوں۔"

وہ حیرانی سے اس کا منہ تکتی رہ گئی۔ اس سے ایسے جواب کی توقع نہ تھی۔ وہ بولا۔ "جانے سے پہلے اتنا ضرور کہوں گا کہ میں پہلی ملاقات سے تمہیں چاہتا ہوں۔ تمہاری زندگی میں جو بھی آنا چاہتا ہے' وہ دولت کا لالچی ہوتا ہے میں محبت کا اظہار کرکے لالچی کہلانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے سلطان صاحب کے مشورے پر تمہارے بچے کے قاتل کو سزا دلانے کے لئے شادی کی بات کہہ دی۔ میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا تمہاری دولت کے قریب نہیں جانا چاہتا' میں تم سے محبت کرتا ہوں اور زندگی کی آخری سانس تک محبت کرتا رہوں گا۔ یہ تمہارا ظرف ہے کہ مجھے گاڑی سے نکال رہی ہو اور یہ میرا ظرف ہے کہ میں تمہیں دل سے نہیں نکالوں گا۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا پھر اسے ایک زوردار آواز سے بند کرکے واپس جھیل کی طرف تیزی سے جانے لگا۔ چند لمحوں تک خالدہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسے وقت کیا کرنا چاہئے۔ پھر وہ جلدی سے دروازہ کھول کر باہر آئی۔ وہ لانبے لانبے ڈگ بھر [illegible] تھا۔ اس نے آواز دی۔ "سرور رک جاؤ۔"

وہ ایسے جارہا تھا جیسے آواز کانوں تک نہ پہنچی ہو۔ وہ اس کے پیچھے جانے لگی۔ اسے آوازیں دینے لگی۔ "رک جاؤ۔ میری بات سن لو۔"

وہ رک گیا۔ اس نے قریب آکر ہانپتے ہوئے کہا۔ "توبہ ہے' تمہارا ایک قدم میرے

چار قدموں کے برابر ہے۔ میں دوڑ کر بھی پکڑنا چاہوں تو نہ پکڑ سکوں۔"

"جب چھوڑ چکی ہو تو پکڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر اس لئے پکڑنے آئی ہو کہ میں تمہاری کوئی چیز چرا کر لے جارہا ہوں تو آؤ تلاشی لے لو۔"

سرور نے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ اس کا چٹان جیسا سینہ بھی پھیل گیا۔ خالدہ نے آگے بڑھ کر تلاشی لینے کے لئے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا' پھر سر رکھا' پھر دل رکھ دیا۔ ایسے مرحلے پر کچھ بولنے اور منانے کی ضرورت نہیں پڑتی' عورت کی ایک ایک ادا زنجیر بن جاتی ہے۔

وہ پابہ زنجیر ہو رہا تھا۔

☆------☆------☆

وہ ایک پہاڑی علاقہ تھا۔ چاروں طرف چھوٹی بڑی پہاڑیاں تھیں۔ ان کے درمیان ایک وسیع وعریض میدان تھا جہاں سینکڑوں خیمے نظر آتے تھے ہزاروں مسلح افراد پہرہ دیتے ہوئے یا ایک خیمے سے دوسرے خیمے کی طرف جاتے دکھائی دیتے تھے۔ وہاں نئے رنگروٹوں کو طرح طرح کے ہتھیاروں سے فائر کرنا سکھایا جاتا تھا۔ دن رات گولیاں چلنے کی آوازیں پہاڑوں میں گونجتی رہتی تھیں۔ کسی بھی ملک کے فوجی اُدھر کا رخ نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ سرحد پار کا ایک قبائلی علاقہ تھا۔ وہیں ریاست علی کو لاکر قید کیا گیا تھا۔

سلطان بیگ نے کہا۔ "تم دہشت گردوں سے معاوضے پر کام لیتے تھے۔ یہاں دیکھو میرے پاس ہزاروں مسلح جوان ہیں جو یہاں سے ٹریننگ حاصل کرکے شہروں میں جاتے ہیں اور ملک دشمن عناصر سے ٹکراتے ہیں جو کام قانون کے محافظ نہیں کرسکتے' وہ ہمارے جوان کرتے ہیں۔ تمہارے دہشت گردوں کے منصوبوں کو ناکام بناتے ہیں۔ تمہارا بھی ایک منصوبہ ناکام ہوچکا ہے۔ اگر اپنی سلامتی چاہتے ہو تو سچ سچ بتاؤ' خالدہ کو ختم کرنے اور اس کی دولت پر قبضہ جمانے کے سلسلے میں تمہارے ساتھ اور کون ہے؟"

"میرے ساتھ کوئی نہیں ہے۔"

"میں شرافت سے پوچھ رہا ہوں۔ جب اس خیمے سے نکل کر جاؤں گا تو کچھ جلاد قسم کے لوگ آئیں گے اور تمہارے جسم سے تھوڑا تھوڑا سا گوشت نوچ کر نکالتے رہیں گے پھر کچھ پوچھے بغیر تم اگلتے رہو گے اور اس ریکارڈر میں تمہارا بیان ریکارڈ ہوتا رہے گا۔"

"میں سچ کہتا ہوں میں نے بلو کو قتل نہیں کرایا ہے۔ میں دولت کا لالچی نہیں ہوں میں خالدہ سے سچی محبت کرتا ہوں۔ اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"جیسے ہیرا بائی سے تم نے سچی محبت کی' پھر شادی کی۔ تم دعویٰ کر رہے تھے کہ خالدہ سے جبراً ایک وارث پیدا کراؤ گے۔ یہ تمہاری سچی محبت ہے تم سیدھی طرح نہیں

بولو گے اور میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔"

وہ خیمے کا پردہ ہٹا کر باہر گیا پھر بولا۔ "دوستو! جاؤ اور اسے سچ بولنا سکھاؤ۔"

چار ہٹے کٹے جوان خیمے کے اندر گئے۔ تھوڑی دیر بعد ریاست علی کی ایسی چیخیں سنائی دیں جیسے اسے ذبح کیا جارہا ہو۔ خالدہ اور سرور ایک خیمے کے باہر کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ سلطان بیگ وہاں آکر بیٹھ گیا خالدہ نے کہا۔ "آپ کا شانہ زخمی ہے' آپ کو آرام کرنا چاہئے۔"

"میں آرام نہیں کرسکتا۔ دو دن کی چھٹی لے کر آیا ہوں۔ ابھی ریاست علی سے اہم باتیں اگلوا کر واپس جاؤں گا۔"

خالدہ نے اسے ایک پیالی دی۔ وہ آہستہ آہستہ چسکی لے کر چائے پینے لگا۔ آدھے گھنٹے کے اندر ہی خیمے سے ایک جوان باہر آیا اور اس نے ایک ریکارڈر سلطان بیگ کے سامنے رکھ دیا۔ اسے ریوائنڈ کرنے کے بعد سنا گیا۔ ریاست علی کہہ رہا تھا۔ "میری امی چاہتی ہیں' خالدہ دوسری بار ہمارے گھر میں بہو بن کر رہے۔ ان کے بڑے بیٹے کی کروڑوں کی جائیداد گھر سے باہر نہ جائے چونکہ ریاست علی شادی شدہ ہے' ایک ننھی سی بچی کا باپ بھی ہے لہٰذا چھوٹے بیٹے حشمت علی سے کسی طرح خالدہ کی شادی ہوجائے۔"

ان چار ہٹے کٹے جوانوں نے ریاست علی کو ایسی اذیتیں پہنچائی تھیں کہ دن میں تارے دکھائی دیئے تھے۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراہتے ہوئے بول رہا تھا۔ "میں نے چھوٹے بھائی حشمت سے کہا کہ وہ تنہا کروڑون کا مالک نہیں بن سکے گا۔ میں اس کے راستے میں رکاوٹ بنتا رہوں گا۔ اگر وہ خالدہ کی دولت میں مجھے برابر کا حصہ دار بنائے گا تو میں جلد ہی اپنے ہتھکنڈوں کے ذریعے اسے تمہاری شریکِ حیات بننے پر مجبور کردوں گا۔ وہ مجھے برابر کا حصے دار بنانے پر راضی ہوگیا۔ ہم نے آپس میں تحریری معاہدہ کیا تاکہ وہ خالدہ سے شادی کے بعد میرا حصہ دینے سے انکار کرے تو میں اس معاہدے کو خالدہ کے سامنے لاکر اسے فراڈ ثابت کرسکوں۔"

کیسٹ ریکارڈر سے اس کی آواز ابھر رہی تھی۔ ایک جوان نے پوچھا۔ "وہ معاہدہ کہاں ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "ایک تحریری معاہدہ حشمت کے پاس ہے۔ پتا نہیں اس نے

کہاں چھپا کر رکھا ہے۔ میں نے اپنے کاغذات بنک کے لاکرز میں رکھے ہیں۔"

اس نے بنک کا نام اور اکاؤنٹ نمبر بتایا۔ لاکر کی ایک چابی اس کی بیوی ہیرا کے پاس رکھی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ "اس معاہدے پر امی کے بھی دستخط ہیں لیکن میں تحریری معاہدے کے باوجود مطمئن نہیں تھا۔ خالدہ کو خود اپنے لئے حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ حشمت کا محتاج نہ رہوں۔ میرے دماغ میں یہی تدبیر آئی کہ اسے اغوا کرکے اس کے ساتھ جبراً شادی کرلوں۔ جب اس کے پاؤں بھاری ہوں گے تو وہ ہونے والے بچے کے خیال سے میری ہربات مان لے گی۔"

اس کا مکمل بیان سننے کے بعد ریکارڈر کو آف کردیا گیا۔ سلطان بیگ نے کہا۔ "اس کے لاکر سے تحریری معاہدہ حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس کے ذریعے ہم ثابت کرسکتے ہیں کہ خالدہ کو تباہ کرنے کے معاملات میں ریاست کی ماں بھی ان کا ساتھ دے رہی تھی۔"

خالدہ نے کہا۔ "اگر ہیرا کو یہ معلوم ہوجائے کہ ریاست مجھ سے شادی کرنے والا ہے تو وہ مجھ جیسی دولت مند سوکن کو برداشت نہیں کرے گی۔ میرے سامنے اس کی حیثیت ایک ملازمہ کی سی ہوگی۔ اس طرح ہیرا کو بھڑکانے سے لاکر کی چابی مل سکتی ہے۔"

بات معقول تھی۔ ابھی تک ہیرا ان کے فراڈ میں اس لئے شامل تھی کہ ان کے منصوبے کے مطابق حشمت' خالدہ سے شادی کرنے والا تھا۔ منصوبے کے برعکس ریاست دوسری شادی کرنا چاہے گا تو ہیرا مخالفت پر اتر آئے گی۔ یہ سوچ کر سلطان بیگ' خالدہ اور سرور اس خیمے میں آئے جہاں ریاست مٹی پر اوندھے منہ پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کا اوپری آدھا جسم ننگا تھا۔ اس کی پیٹھ پر دو چار جگہ تھوڑا تھوڑا سا گوشت اس طرح نچا ہوا تھا جیسے کسی درندے نے تیز نوکیلے ناخن جسم میں پیوست کرکے ایک ایک چٹکی گوشت نوچ لیا ہو۔

سلطان بیگ نے کہا۔ "تم نے تھوڑی سی سزا پاکر بیان دیا ہے۔ مجھے یقین ہے' مزید کوئی سزا پائے بغیر تم دو خط لکھو گے۔ ایک اپنی بیوی ہیرا کو اور دوسرا اپنے بھائی حشمت کو۔ دونوں خطوں میں یہ دعویٰ کرو گے کہ تم نے خالدہ کو اغوا کرنے کے بعد اسے شادی پر آمادہ کرلیا ہے اور اسے اعتماد میں لینے کے لئے اس تحریری معاہدے کے متعلق بتادیا ہے جو دو بھائیوں کے درمیان ہوا تھا۔ اس طرح خالدہ تمہاری سچائی سے بے حد خوش ہے۔

حشمت اس معاہدے کے ذریعے تمہیں بلیک میل نہیں کرسکے گا۔ وہ معاہدہ اب ایک فضول سے کاغذ کے ٹکڑے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ چلو اٹھو اور آرام سے بیٹھ کر لکھنا شروع کردو۔ تم جتنی جلدی لکھو گے اتنی ہی جلدی تمہاری مرہم پٹی ہوسکے گی۔"

وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تکلیف کی شدت سے کانپتے ہوئے بولا۔ "مجھ پر رحم کرو۔ پہلے میرا علاج کراؤ مجھے کچھ کھانے کے لئے دو۔ تم جیسا کہو گے ویسا ہی لکھوں گا۔"

"پہلے تم لکھو گے۔ اس کے بعد تمہاری فرمائش پوری ہوگی۔ اپنی تحریر کا انداز بدلنے کی حماقت نہ کرنا۔ میں شہر جاکر تمہاری تحریر کے کچھ نمونے حاصل کرکے موجودہ تحریر سے موازنہ کروں گا۔ اس کے بعد یہ خط تمہاری بیوی اور بھائی کے پتے پر پوسٹ کروں گا۔"

اس کے لئے ایک لیٹر پیڈ اور قلم منگوایا گیا۔ وہ سر جھکا کر لکھنے بیٹھ گیا۔ اگرچہ بے حد تکلیف میں مبتلا تھا' تاہم جلد ہی مرہم پٹی کرانے کے لئے سنبھل سنبھل کر لکھ رہا تھا۔ جب دونوں خطوط مکمل ہوگئے تو سلطان بیگ نے اس کی مرہم پٹی کا حکم دیا پھر باہر آکر بولا۔ "خالدہ! تم سرور کے ساتھ یہاں رہو گی۔ میں رات ایک بجے ٹرانسمیٹر پر رابطہ کروں گا۔ ان کا تحریری معاہدہ ہاتھ آتے ہی تم دونوں کو بلالوں گا۔"

فی الحال بازی پوری طرح خالدہ کے حق میں تھی۔ اگر وہ تحریری معاہدہ ہاتھ آجاتا تو اغوا کا ڈراما پلے کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ خالدہ خواہ مخواہ کی بدنامی سے محفوظ رہتی۔ سلطان بیگ نے شہر پہنچ کر سب سے پہلے وہ دونوں خطوط پوسٹ کئے پھر دفتر میں حاضری دی۔ وہاں عالی جناب کا پیغام تھا کہ دفتر پہنچتے ہی فون پر رابطہ قائم کرے۔ اس نے فون پر رابطہ قائم کیا۔ دوسری طرف سے عالی جناب نے کہا۔ "آدھے گھنٹے کے اندر پولیس اسپتال پہنچو' میں بھی آرہا ہوں۔"

وہ حکم کے مطابق اسپتال پہنچا' ایک گھنٹے تک عالی جناب کا انتظار کرتا رہا جب کہ اسے آدھے گھنٹے کے اندر وہاں پہنچنے کا حکم دیا گیا تھا۔ بہرحال اس نے ایک گھنٹے بعد دیکھا' اسپتال کے احاطے میں فوجیوں کی دو گاڑیاں آئیں پولیس اسپتال میں فوجی افسر اور جوانوں کا آنا کوئی خاص اہمیت رکھتا تھا۔ ان کے ساتھ عالی جناب بھی تھا۔ اس نے ایس پی سلطان

بیگ کو اپنے ساتھ آنے کا حکم دیا۔ پھر فوجی افسر کے ساتھ مردہ خانے پہنچا۔ وہاں کئی لاشیں سفید چادروں میں چھپی ہوئی تھیں۔ جب ان چادروں کو ہٹایا گیا تو سلطان بیگ کا چہرہ اتر گیا۔ وہ جھیل کنارے ہلاک ہونے والے دہشت گردوں کی لاشیں تھیں عالی جناب نے کہا۔ "مسٹر سلطان بیگ! مجھے یقین ہے کہ یہ صورتیں تمہارے لئے اجنبی نہیں ہوں گی۔"

اس نے کہا۔ "آپ یقین سے نہ کہیں۔ یہ میرے لئے اجنبی ہیں۔"

عالی جناب نے ایک لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہمارے شہر کے بہت بڑے علاقے کا بہت ہی معزز شخص ہے۔ پرسوں اپنے ساتھیوں کے ساتھ پکنک منانے جھیل کی طرف گیا تھا۔ ہمیں جو رپورٹ دی گئی ہے' اس کے مطابق تم بھی پرسوں وہیں تھے۔"

"جناب آپ تک پہنچنے والی رپورٹ غلط ہے۔" سلطان بیگ ڈھٹائی سے انکار کر رہا تھا۔ عالی جناب جسے ایک بڑے علاقے کا معزز شخص کہہ رہا تھا۔ وہ دراصل ایک معزز غنڈہ تھا۔ جب ایک غنڈہ اپنی طاقت اور پولیس کی مدد سے پورے علاقے میں اپنی دہشت طاری کر دیتا ہے تو وہ معزز دولت مند کہلانے لگتا ہے۔ اس علاقے کے تھانے کا انچارج اور اس کے اعلیٰ افسران اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ دہشت گردوں کا لیڈر ہے لیکن نیچے سے لے کر اوپری افسران تک لاکھوں روپے پہنچتے رہتے تھے۔ اس لئے وہ معزز شخص کہلانے لگا تھا۔

سلطان بیگ' عالی جناب اور دو فوجی افسروں کے ساتھ مردہ خانے سے نکل کر اسپتال کے ایک کمرے میں آیا۔ پرسوں رات اس کے ساتھ چار سپاہی تھے جن میں سے دو جھیل کے کنارے مارے گئے تھے۔ باقی دو سپاہی اس کے ساتھ اس خفیہ کیمپ میں گئے تھے جہاں ریاست علی کو قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ وہ دونوں سپاہی پچھلے دو برسوں سے سلطان بیگ کے نہایت وفادار اور قابلِ اعتماد ماتحت رہے تھے۔ ان میں سے ایک سپاہی اسپتال کے اس کمرے میں موجود تھا۔ عالی جناب نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ انٹیلی جنس کا آدمی ہے تمہارا وفادار بن کر رہتا تھا۔ مسٹر سلطان بیگ' ہمیں شبہ تھا کہ تم دہشت گردوں کے سرغنہ ہو۔ تمہارے آدمی کہیں سے ٹریننگ حاصل کر کے آتے ہیں اور

شہروں میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کرتے ہیں۔"

سلطان بیگ نے کہا۔ "جناب' یہ مجھ پر الزام ہے میں اپنے ملک کا وفادار ہوں۔"

"یو شٹ اپ۔ جب تک بولنے کی اجازت نہ دی جائے' خاموشی سے سنتے رہو۔ انٹیلی جنس کا یہ جاسوس صرف اس وقت تک تمہارا وفادار تھا جب تک اس نے وہ خفیہ کیمپ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ آج اس نے وہاں کا سارا حال بتا دیا ہے۔ کل صبح ہمارے فوجی جوان اس آزاد قبائلی علاقے کا محاصرہ کریں گے۔ تمہارے دہشت گردوں میں جو ہتھیار ڈال کر خود کو گرفتاری کے لئے پیش کرے گا وہ زندہ رہے گا' اس پر مقدمہ چلے گا اور جو مقابلہ کرے گا' وہ مارا جائے گا۔ ان کے نتائج سامنے آنے تک تم حراست میں رہو گے۔ چونکہ یہ معاملہ فوج کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے لہٰذا یہ فوجی افسران تمہیں ٹارچر چیمبر میں لے جا رہے ہیں۔"

سلطان بیگ کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی گئی اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ وہ بزدل نہیں تھا' موت کو ہنس کر گلے سے لگا سکتا تھا لیکن ٹارچر چیمبر ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں قیدیوں کو اذیتیں پہنچانے کی انتہا کر دی جاتی ہے۔ جب وہ چیمبر سے نکلتے ہیں تو زندہ ہوتے ہیں مگر مردے سے بدتر ہوتے ہیں اور اپنے اندر کا سارا راز اگل چکے ہوتے ہیں۔

وہ بزدل نہیں تھا۔ پریشان تھا۔ کیونکہ برسوں کی محنت سے قائم کیا ہوا خفیہ کیمپ تباہ ہونے والا تھا اور ہزاروں تربیت یافتہ محبان وطن اچانک فوجی حملے کے نتیجے میں مارے جانے والے تھے۔

☆======☆======☆

ریاست علی کی گمشدگی سے سارا گھر پریشان تھا۔ وہ پہلی رات گھر نہیں آیا' اس بات کا نوٹس کسی نے نہیں لیا۔ ماں سے لے کر بیوی تک جانتی تھی' وہ عیاش ہے۔ کسی داشتہ کے ہاں رہ گیا ہوگا۔ جب وہ دوسرے دن نہیں آیا اور نہ ہی فون کے ذریعے رابطہ قائم کیا تو تشویش پیدا ہوئی۔ ماں اس کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگی۔ ہیرا اس کے دوست احباب کے نمبروں پر فون کرنے لگی۔ ہر نمبر سے یہی جواب مل رہا تھا کہ کسی نے اسے پچھلے دن سے نہیں دیکھا۔ اس روز کا اخبار توجہ سے پڑھا گیا۔ کہیں کار' بس یا ٹرک وغیرہ کے حادثات میں اس کا نام مل جائے۔ وہ دوسری رات بھی نہیں آیا۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا

تھا۔ کبھی ایک رات غائب رہنے کے بعد ہی وہ کہیں سے فون پر گھر والوں سے بات ضرور کرتا تھا۔ اب تشویش حد سے بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی۔ تمام اسپتال والوں سے رابطہ قائم کیا لیکن اس کے متعلق اچھی یا بری کوئی خبر نہ مل سکی۔ ماں سے زیادہ بیوی ہیرا اور بھائی حشمت علی پریشان تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ریاست نے چند دہشت گردوں کو خالدہ کے پیچھے لگایا ہے اور کوئی اہم اطلاع ملنے پر ان شرپسندوں کے ساتھ خود کہیں گیا ہے۔ چونکہ خالدہ کا محافظ ایس پی سلطان بیگ تھا۔ اس لئے اندیشہ تھا کہیں مقابلے میں ریاست علی گرفتار نہ ہوا ہو یا مارا نہ گیا ہو اور حشمت علی سوچ رہا تھا۔ ریاست علی بھائی جان کہیں دھوکا نہ دے رہے ہوں۔ خالدہ کے ہاتھ آتے ہی نیت نہ بدل گئی ہو۔

تین دن کے بعد حشمت علی کو جو خط ملا' اس سے شبہ یقین میں بدل گیا۔ ریاست نے اسے لکھا تھا۔ "خالدہ کو میں نے ایک جگہ قید کر رکھا ہے۔ میں نے پہلے اسے پیار ومحبت سے سمجھانے کی کوشش کی کہ تم سے شادی کرلے لیکن یہ کسی سے بھی شادی پر راضی نہیں ہوتی ہے۔ بالکل ایک بے لگام گھوڑی ہے۔ اسے صرف میں ہی قابو میں رکھ سکتا ہوں۔ لہٰذا یہ اس وقت تک قید میں رہے گی جب تک میرے بچے کی ماں نہ بن جائے۔ ایسی صورت میں یہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ مجبور ہو کر مجھ سے شادی کرلے گی۔ عورت خواہ کیسی ہی سخت اور مضبوط قوتِ ارادی کی مالک ہو' وہ ماں بن کر موم ہوجاتی ہے۔ اپنے بچے کو اس کے باپ کا نام دلانے کی خاطر حالات سے سمجھوتہ کرلیتی ہے۔ خالدہ بھی مجھ سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہوجائے گی۔ میرے بھائی حشمت' یہ نہ سمجھنا میں تمہاری دولت تم سے چھین رہا ہوں۔ ہمارے درمیان جو آدھے آدھے کا سودا ہے' وہ برقرار رہے گا۔ معاہدے کے مطابق ہم خالدہ کی دولت میں برابر کے حصے دار رہیں گے۔ اس معاہدے کے خلاف صرف اتنا ہو رہا ہے کہ خالدہ تمہاری شریکِ حیات نہیں بن سکے گی۔ جب میں اسے دلہن بنا کر گھر لاؤں گا تو اس کی گود میں میرا بچہ ہوگا۔ اس وقت تک میں اس کے ساتھ گمنامی کی زندگی گزاروں گا۔ مجھے تلاش نہ کیا جائے۔ قریبی رشتے داروں سے کہہ دیا جائے کہ میں کسی اہم کام سے کسی بیرونی ملک میں قیام کر رہا ہوں۔ امی کو یقین دلانا کہ ان کا بیٹا کامیاب ہو کر آئے گا۔ فقط تمہارا بھائی

ریاست علی۔"

حشمت نے خط پڑھتے ہی غصے سے اس کاغذ کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ اس کا جی چاہتا تھا خط کے ٹکڑے ٹکڑے کردے۔ اس طرح کچھ تو تسلی ہوتی کہ دھوکا دینے والے بھائی کے ٹکڑے کر رہا ہے لیکن اس خط کو ثبوت کے طور پر رکھنا ضروری تھا۔ کبھی بھائی کے خلاف کسی کارروائی میں وہ خط اور تحریری معاہدہ کام آسکتا ہے۔ وہ غصے سے ماں کے پاس گیا۔ پھر سامنے خط پھینکتے ہوئے کہا۔ "اسے پڑھیئے۔"

ماں نے خط پڑھا۔ پھر اطمینان سے گہری سانس لے کر بولی۔ "خدا نے میری دعا سن لی۔ میرا بیٹا خیریت سے ہے۔"

وہ غصے سے بولا۔ "جی ہاں خیریت سے ہے اور میری خیریت اپنے نام کرتا جا رہا ہے۔ وہ بھائی نہیں' سانپ ہے۔ مجھے اپنی مکاریوں سے ڈس رہا ہے۔"

"خاموش رہو۔ بے ادب نہ بنو۔ وہ تمہارا بھائی ہے اس نے درست لکھا ہے کیا تم خالدہ کے مزاج کو نہیں جانتے؟ وہ ضد کی پکی ہے۔ ایسی عورت کو توڑنے یا جھکانے کے لئے وہی مناسب ہے جو ریاست کر رہا ہے۔"

"ایسا میں بھی کرسکتا ہوں۔ بھائی ریاست نے خالدہ کو جہاں قید کیا ہے' وہ جگہ مجھے بتاسکتے تھے۔ اس خط میں پتا لکھ کر وہ مجھے وہاں بلاسکتے تھے یا فون پر گفتگو کرسکتے تھے یا رازداری سے چپ چاپ رات کو آکر مجھے خالدہ کے پاس پہنچا سکتے تھے لیکن شروع سے ان کی نیت میں کھوٹ تھا۔ وہ خالدہ کی کروڑوں کی دولت اور جائیداد پر سانپ بن کر بیٹھنا چاہتے تھے۔ اب انہیں اس کا موقع مل گیا ہے۔"

ماں نے سمجھایا۔ "بیٹا! ناک دائیں سے پکڑو یا بائیں سے' وہ ناک ہی ہوگی۔ خالدہ سے تم شادی نہ کرو' وہ کرلے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ دولت گھر ہی میں آئے گی۔ معاہدہ کی رو سے تمہیں حصہ برابر ملے گا۔"

"خاک ملے گا۔ خالدہ شاید مجبور ہو کر بھائی ریاست سے شادی کرلے مگر اپنے جیتے جی کاروبار اور زمینوں کی آمدنی پر انہیں ہاتھ نہیں رکھنے دے گی۔ وہ بڑی چالاک عورت ہے۔ سب کچھ اپنی اولاد کے نام لکھے گی اور اولاد بھائی ریاست کی ہوگی پھر بھائی صاحب فرمائیں گے میرا تحریری معاہدہ ان سے ہوا تھا اور ان کے نام کچھ نہیں ہوگا۔ اس تحریری

معاہدے کی اہمیت ختم ہوجائے گی۔"

ماں نے تسلی دی۔ "اسے آنے دو میں معاہدے میں تبدیلیاں کراؤں گی۔"

یہ محض تسلی تھی۔ وہ تسلیوں سے مطمئن ہونے والا نہیں تھا۔ اب اپنی عقل اور تدبیر سے کام لینے کا وقت آگیا تھا۔ وہ ہیرا بھابی کے پاس آیا۔ اُدھر وہ غصے میں بھری بیٹھی تھی حشمت نے اسے خط دکھاتے ہوئے کہا۔ "آپ کے مجازی خدا نے مجھے لکھا ہے کہ وہ خالدہ سے شادی کرنے والے ہیں جب تک شادی نہیں ہوگی اور اولاد نہیں ہوگی' وہ خالدہ کے ساتھ روپوش رہیں گے۔ یہ لیجئے' آپ خود پڑھ کر دیکھ لیجئے۔"

ہیرا نے کہا۔ "میرے پاس بھی کچھ ایسا ہی خط آیا ہے۔"

"کیا آپ سوکن کو برداشت کرلیں گی؟"

"نہ میں اسے برداشت کروں گی اور نہ وہ مجھے برداشت کرے گی۔ تمہارے بھائی نے لکھا ہے' میں طلاق لے لوں۔ وہ یہاں آتے ہی اپنی زمینیں بیچ کر میرے مہر کی رقم ادا کریں گے۔ اگر میں بیوی بن کر رہنا چاہوں تو انہیں خوشی ہوگی لیکن خالدہ کے سامنے یہی ظاہر کیا جائے گا کہ ہماری طلاق ہوگئی ہے۔"

"ہمارے بھائی صاحب خود کو بہت چالاک سمجھ رہے ہیں۔ مجھے یقین دلا رہے ہیں کہ دولت میں برابر حصہ ملے گا۔ آپ کو یقین دلا رہے ہیں کہ طلاق بھی دیں گے' مہر کی رقم بھی ادا کریں گے اور رازداری سے آپ کو بیوی بنا کر بھی رکھ سکتے ہیں۔ وہ ہماری پانچوں انگلیاں گھی میں نہیں ڈال رہے ہیں صرف ہمارے سر جلتی کڑاہی میں ڈال رہے ہیں۔"

"میں نادان نہیں ہوں۔ ان کی چالبازی خوب سمجھتی ہوں۔ میں یہ شادی نہیں ہونے دوں گی۔"

حشمت نے خوش ہو کر کہا۔ "آپ میرے دل کی بات کہہ رہی ہیں لیکن ہم نہیں جانتے' وہ خالدہ کے ساتھ کہاں روپوش ہیں۔ آپ انہیں شادی سے کیسے روک سکیں گی؟"

"ہم دونوں کو جو خطوط ملے ہیں' وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ انہوں نے خالدہ کو اغوا کیا ہے' ایک جرم تو یہ ہوا۔ دوسرا جرم یہ کرنے جارہے ہیں کہ ایک بیوہ کے ساتھ گناہ گار بننا چاہتے ہیں۔ اسے جبراً بچے کی ماں بنا کر شادی پر مجبور کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی اغوا بھی'

گناہ بھی اور تشدد بھی۔ یہ سراسر پولیس کیس ہے۔ میں یہاں سے شائع ہونے والے تمام اخبارات کے دفتروں میں جا رہی ہوں۔ وہاں پورے اور آدھے صفحات کا اشتہار بک کراؤں گی جس پر جلی حرفوں میں لکھا ہوگا۔ "ریاست علی! اشتہاری مجرم بننے اور قانون کی گرفت میں آنے سے پہلے اپنے ارادوں سے باز آجاؤ۔ اسے پڑھتے ہی شام تک واپس نہ آئے تو تمہارے خطوط قانون کے محافظوں تک پہنچ جائیں گے۔ فقط تمہاری ہیرا۔"

"میں اس معاملے میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آئیے میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔"

ان دونوں نے تمام اخبارات کے دفاتر میں جاکر ریاست کے خلاف پہلا قدم اٹھایا۔

دوسرے دن کے اخباروں میں ہیرا کی وارننگ شائع ہوئی۔ وہ اور حشمت شام تک بلکہ رات گئے تک اس کا انتظار کرتے رہے لیکن وارننگ کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ وہ واپس نہیں آیا۔ ماں نے سمجھایا اس کے خلاف قانونی کارروائی نہ کرو لیکن ہیرا ماننے والی نہیں تھی اس نے تھانے میں خالدہ کے اغوا کی رپورٹ درج کرائی۔ ریاست علی کے خط کی کاپیاں کرائیں۔ کمشنر صاحب سے ملاقات کی اور کہا۔ "میں اپنے شوہر کے خلاف اور بھی کئی ٹھوس ثبوت پیش کرسکتی ہوں پلیز آپ ایک شریف بیوہ کی عزت بچانے کے لئے فوری اقدامات کریں۔"

کمشنر نے اسے بھرپور تعاون کا یقین دلایا پھر یہ معاملہ پولیس کے اعلیٰ افسران تک پہنچایا۔ ایک گھنٹے بعد ہی کمشنر صاحب کو عالی جناب نے بتایا۔ "ریاست علی پُراسرار دہشت گرد گروہ کا قیدی ہے۔ یہ معاملہ فوج کے ہاتھ میں ہے اس سلسلے میں ہم سب کو خاموشی اختیار کرنی چاہئے۔ ریاست علی کے رشتے داروں کو دلاسے دیئے جائیں کہ اسے تلاش کیا جارہا ہے۔"

کوئی بھی دہشت گرد تنظیم چند غنڈوں اور قاتلوں کے گٹھ جوڑ سے کبھی قائم نہیں ہوتی۔ اس کے پیچھے رشوت خور پولیس افسروں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ پھر ان افسروں کا تحفظ حکومت کے چند اعلیٰ عہدے دار کرتے ہیں۔ ان عہدے داروں کو کسی بڑے ملک سے دولت اور طاقت حاصل ہوتی ہے اور وہ بڑا ملک اپنے مفادات کے مطابق گاہے بگاہے تخریبی کارروائیاں کراتا ہے تاکہ حکومت وقت پر اپنے مفادات کی تکمیل کے لئے دباؤ ڈالتا رہے۔

عالی جناب کو یقین تھا کہ وہ جس طرح خود ایک بڑے ملک کے دباؤ میں آکر دہشت گردوں کو چھوڑ دیتے ہیں' اسی طرح ایس پی سلطان بیگ نے کسی دوسرے ملک سے ساز باز کی ہے اور اس ملک سے دولت اور طاقت اور جدید قسم کے ہتھیار حاصل کر کے قبائلی علاقے میں اپنے آدمیوں کو ٹریننگ دلانے کی سہولتیں فراہم کر رہا ہے۔

اس یقین کے پیشِ نظر سرحد پار قبائلی علاقے پر سوچے سمجھے بغیر فوجی حملہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ انہیں انٹیلی جنس کے صرف ایک جاسوس نے وہاں کے متعلق اطلاع دی تھی وہ اور زیادہ معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی فوجی کارروائی کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا پہلے ملٹری انٹیلی جنس کے کئی جاسوس اُدھر روانہ کئے گئے۔ انہوں نے دو دنوں میں وہاں تک پہنچنے کے راستوں اور خفیہ کیمپ کی تصویروں کے ساتھ مکمل رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ کے پیشِ نظر خفیہ کیمپ کے محاصرے کا منصوبہ بنایا گیا پھر ایک رات بھاری تعداد میں فوجی جوانوں نے اس علاقے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

خالدہ اور سرور اب تک اسی کیمپ میں تھے اور ایک دوسرے کے جیون ساتھی بننے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ خالدہ اب اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ ایک پولیس افسر کو بھائی بنا کر اپنی دولت سے اور ہتھیار استعمال کرنے کے ہنر سے بھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اس کی دولت پر قبضہ جمانے کی سازش کرنے والوں کو منہ توڑ جواب دینے کے لئے سرور سے ضرور شادی کرنی چاہئے۔ اس طرح موت بھی آئے گی تو آخری سانسوں میں کوئی چاہنے والا اس کے قریب ہوگا۔

کیمپ میں پہنچنے کے چوتھے دن وہ سرور کے ساتھ ایک قبائلی بستی میں گئی جو پہاڑی کے دوسری طرف تھی۔ وہاں ایک قاضی صاحب نے ان کا نکاح پڑھایا۔ ان کے سردار نے کہا۔ "تم میاں بیوی ہماری بستی میں سات دن مہمان رہو گے۔ یہاں تمہاری شادی کا جشن منایا جائے گا اور تمہاری ضرورت کی ہر چیز مہیا کی جائے گی۔"

وہاں کچے مکانات تھے۔ خالدہ ایک مکان میں سرور کی دلہن بن کر آئی تو دور دور تک فائرنگ کی آوازیں گونج رہی تھیں قبیلے کے لوگ ہوائی فائر کرتے ہوئے خوشیوں کا اظہار کر رہے تھے۔ سرور نے اس کا گھونگھٹ اٹھا کر ایک سرخ گلاب پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں دلہن کا جلوہ دیکھنے کے لئے میں سونا چاندی پیش نہیں کر سکوں گا۔ محبت کا یہ

گلاب حاضر ہے۔"

اس نے ایک گلاب پیش کیا اور سراپا گلاب کو اپنا لیا۔ شہری زندگی گزارنے والے کبھی کہتے تھے کہ قبائلی پرانے رسم ورواج کے پابند ہوتے ہیں۔ شادی بیاہ کی مسرتوں میں بندوق چلاتے ہیں۔ جب کہ دلہن کو بندوق کے شور میں نہیں شہنائیوں کے جذباتی سروں اور مہکتے ہوئے پھولوں میں بسا کر گھر لانا چاہئے۔ آج شہری تہذیب بھی کلاشنکوف سے چھلنی ہو رہی ہے۔ شہنائیوں کے سُروں میں اور گلوں کی خوشبوؤں میں آنے والی کسی دلہن کا سرخ جوڑا اس کے لہو سے سرخ ہو جاتا ہے' بندوق اور پھول کی تہذیبیں گلے مل چکی ہیں۔

وہ دونوں محبتوں اور جذبوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ایک ایسے عالم میں تھے جہاں نفرت کا ہلکا سا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ جہاں موت کبھی قدم نہیں رکھتی' جہاں ایک زندگی سے دوسری زندگی روشن ہوتی ہے اور دو زندگیوں سے تیسری زندگی کے وجود کی بنیاد پڑتی ہے۔ خالدہ جذبوں میں ڈوب کر بھی یہی کہہ رہی تھی۔ "میں دوسرے ببلو کو جنم نہیں دوں گی۔ میرے سرور! میرے سر اور "ور" کے مالک! مجھ سے سب کچھ لو اور مجھے سب کچھ دو مگر ایک اور ببلو نہ دو۔ ہماری یہ دنیا اب کسی معصوم بچے کے قابل نہیں رہی۔ تم مردانگی دکھانے والے لوگ جس روز اس دنیا کو امن و آشتی کا گہوارہ بناؤ گے' میں تمہیں ایک خوبصورت بچہ انعام میں دوں گی۔"

ان کے دامنوں میں سہاگ کے پھول کھل رہے تھے۔ باہر دور تک فائرنگ کی آوازیں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے آرہی تھیں۔ پھر یہ وقفہ ختم ہوگیا۔ اب مسلسل فائرنگ کے ساتھ زبردست دھماکے بھی سنائی دے رہے تھے۔ وہ دونوں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ "سرور بھائی! ہوشیار رہو۔ کیمپ والوں پر فوجی حملہ ہو رہا ہے۔"

وہ دونوں بھاگتے ہوئے غسل خانے میں گئے۔ خالدہ نے گوریلا جنگ کی تربیت حاصل کی تھی۔ ایسے وقت وہ محض ایک عورت اور دلہن نہیں تھی۔ وہ آدھے گھنٹے کے اندر غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر جینز اور جیکٹ میں ملبوس ہو چکی تھی۔ کمر سے کارتوسوں کی پیٹی بندھی ہوئی تھی۔ کارتوسوں کی ایک پیٹی شانے سے لٹک رہی تھی۔ ہاتھ میں

کلاشنکوف تھی۔ پشت پر ہینڈ گرنیڈ سے بھرا ہوا بیگ بندھا ہوا تھا۔ جب وہ کمرے سے باہر آئی تو سرور بھی پوری طرح مسلح ہوچکا تھا۔ قبائلی سردار کہہ رہا تھا۔ "تم ہماری بستی میں مہمان ہو۔ کیمپ کی طرف نہیں جاؤ گے۔ ہمارے آدمی دیکھنے گئے ہیں' حملہ آور کون ہیں اور کتنے ہیں۔ یہ اچانک ہونے والی جنگ کس مرحلے پر ہے اور کس کے حق میں ہے اور یہ کیمپ والوں کے حق میں نہ ہوئی تو تم دونوں بھی جان سے جاؤ گے اور یہ میری مہمان نوازی کی توہین ہوگی۔"

سرور نے کہا۔ "سردار! اگر وہ واقعی فوجی ہوئے تو تم ہماری وجہ سے مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ ہمیں پناہ دینے کے مجرم سمجھے جاؤ گے اور سزا کے طور پر یہ بستی بھی تباہ کردی جائے گی۔"

سردار نے کہا۔ "یہ علاقہ صدیوں سے آزاد ہے۔ آج تک کسی ملک کی فوج نے یہاں حملہ نہیں کیا ہمارے چاروں طرف جتنے ممالک ہیں' ان سب سے ہمارا سمجھوتہ ہے کہ ہم اس علاقے کو کسی بھی ملک کا فوجی اڈا نہیں بننے دیں گے اور نہ ہی کسی فوج کی گولی ادھر آئے گی۔ اگر آج کسی نے معاہدے کے خلاف حملہ کیا تو ہم گولیوں کا جواب گولیوں سے دینا جانتے ہیں۔ تم دونوں ہمارے آدمیوں کے ساتھ جاؤ۔ میں آنے والوں سے نمٹ لوں گا۔"

خالدہ اور سرور کو اس کے آدمیوں کے ساتھ جانا پڑا۔ اطلاع مل رہی تھی کہ پہاڑیوں کے درمیان وسیع میدان میں جو خفیہ کیمپ قائم کیا گیا تھا' اسے فوج نے گھیر لیا ہے۔ دونوں طرف سے فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ ایسی صورت میں ادھر جانا خودکشی کے مترادف ہوتا۔ وہ رشتہء ازدواج میں منسلک ہونے پہاری کے پیچھے قبائلی بستی میں آئے تھے۔ ابھی ان کے مقدر میں زندگی باقی تھی' شادی ایک بہانہ بن گئی تھی۔ وہ چند قبائلیوں کے ساتھ رات کے اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے اور سنبھلتے ہوئے ایک غار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ دن کا وقت ہوتا تو کیمپ والا میدانی علاقہ وہاں سے نظر آتا کیونکہ وہ بستی میں تھا۔ رات کی تاریکی میں صرف فائرنگ اور بم کے دھماکوں سے پیدا ہونے والے شعلے دکھائی دے رہے تھے۔ خالدہ نے سرور کے شانے پر سر رکھ کر کہا۔ "اوہ خدایا! یہ کیا ہوگیا۔ ہماری برسوں کی محنت برباد ہو رہی ہے۔"

سرور نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔ "خدا محنت برباد نہیں کرتا' صرف آزمائشوں سے گزارتا ہے۔ آزمائش کی اس گھڑی میں ہمیں ثابت قدم رہنا ہے۔ اگر ہم دو ہی بچ گئے تو ایک نئے حوصلے سے دو سے دو ہزار اور دو لاکھ ہوجائیں گے۔"

تھوڑی دیر کے لئے فائرنگ رک گئی تھی۔ میگافون کے ذریعے کچھ کہا جارہا تھا۔ دور کے الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے پھر قریب ہی ایک چٹان کی بلندی سے قبائلی سردار ملک دلاور خان کی آواز گونجنے لگی وہ کہہ رہا تھا۔ "رات کے اندھیرے میں حملہ کرنے والے بزدلو! ان پیچیدہ پہاڑیوں اور گھاٹیوں سے تمہیں واپس جانے کا راستہ نہیں ملے گا۔ جس راستے سے تم آزاد علاقے میں داخل ہوئے ہو' ہمارے آدمیوں نے اس راستے کی ناکہ بندی کردی ہے۔ اپنی سلامتی چاہتے ہو تو فائرنگ بند کردو' ہتھیار پھینک دو' ملک دلاور خان ایک بار زبان سے بولتا ہے۔ اس کے بعد گولیوں کی زبان سے بات کرتا ہے۔"

اس کی آواز ختم ہوتے ہی بہت دور کی پہاڑی سے ایک اور شخص کی آواز گونجنے لگی۔ خالدہ اور سرور کے ساتھ آنے والوں نے بتایا۔ "یہ دوسری بستی کا سردار ملک گلاب خان ہے۔ یہ بھی حملہ آوروں کو وارننگ دے رہا ہے۔ اس کے بعد دوسری تیسری پہاڑیوں میں رہنے والے سردار بھی صرف ایک ایک بار وارننگ دیں گے اگر حملہ آوروں نے ہتھیار نہ ڈالے تو صبح تک ان میں سے کوئی زندہ واپس نہیں جاسکے گا۔"

وہ جو کہہ رہے تھے' وہی ہو رہا تھا۔ حملہ کرنے والوں کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہ چاروں طرف سے گھیر لئے گئے ہیں انہوں نے فائرنگ روک دی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میگافون سے آواز سنائی دی۔ "جناب ملک دلاور خان صاحب! میں فوج کا میجر آپ کے پاس آرہا ہوں۔ میں اور میرے چار جوان خالی ہاتھ ہیں مجھے یقین ہے آپ میں سے کوئی گولی نہیں چلائے گا۔"

تھوڑی دیر بعد ایک فوجی گاڑی بستی میں داخل ہوئی۔ سردار نے میجر کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ انہیں عزت سے بٹھایا۔ پھر کہا۔ "یہ ہماری روایت ہے' ہم گھر آنے والے دشمنوں کی بھی عزت کرتے ہیں اور پہلے محبت سے پوچھتے ہیں' دشمنی کیا ہے؟"

میجر نے کہا۔ "دشمنی آپ سے نہ ہے نہ کبھی ہوسکتی ہے لیکن آپ شاید نہیں جانتے کہ ان پہاڑیوں کے درمیان میدانی علاقے میں کیمپ لگانے والے دہشت گرد ہیں۔

یہ ہماری سرحد میں داخل ہوتے ہیں اور ہمارے شہروں کے امن وامان کو غارت کردیتے ہیں۔"

سردار نے کہا۔ "ہم ان پہاڑوں اور چٹانوں کے پالے ہوئے ہیں۔ اپنی آستین میں سانپ نہیں پالتے۔ دوست اور دشمن کو خوب پہچانتے ہیں۔ ایک تو تم عقل کے اندھے ہو دوسرے رات کی تاریکی میں گولیاں چلانے آئے ہو۔ کسی سے سن لیا کہ یہ دہشت گرد ہیں۔ آنکھوں سے یہ نہیں دیکھا کہ یہ مسلمان ہیں۔ تمہارے ملک کے باشندے ہیں اور جان نثار محبِ وطن ہیں۔ تم نے اپنے وطن کو اندھیر نگری بنا رکھا ہے۔ یہ جیالے اسے روشن رکھنے کے لئے یہاں تربیت حاصل کرتے ہیں اور ان دہشت گردوں کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملاتے ہیں' جو ڈرگ مافیا کے آلۂ کار ہوتے ہیں۔"

"ملک صاحب! اگر ہماری غلطی ہوئی تو ہم مان لیں گے لیکن آپ کیسے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہاں سے تربیت حاصل کرکے جانے والے محبِ وطن ہوتے ہیں؟ جس کے ہاتھ میں بندوق آتی ہے' وہ شہ زور' لالچی اور دولت پرست ہوجاتا ہے منشیات اور اسلحہ کے کاروبار کو پھیلانے والوں کے لئے وطن دشمنوں کا آلہ کار بن جاتا ہے۔"

سردار نے کہا۔ "بے شک ہم کسی کی نیت کو سمجھ نہیں سکتے لیکن اپنے طور پر احتیاطی تدابیر کرتے ہیں۔ تربیت حاصل کرنے والے جوانوں کو سخت آزمائش سے گزارا جاتا ہے کسی کے متعلق ثبوت مل جائے کہ وہ ملکی مفادات کے خلاف کام کررہا ہے تو اسے بے دریغ گولی مار دیتے ہیں۔"

میجر نے کہا۔ "یہی ہم بھی کرتے ہیں اور یہی کرنے آئے ہیں۔ ہم نے ایس پی سلطان بیگ کو ایک قاتل کی حیثیت سے گرفتار کیا ہے۔ اس نے شہر کے ایک معزز شخص کو اس کے ساتھیوں سمیت جھیل کنارے قتل کیا ہے۔ یہ کام وہ اکیلا نہیں کرسکتا تھا۔ ہمارا ایک جاسوس اس کے وفادار کی حیثیت سے اس خفیہ کیمپ تک آ[illegible] ثابت ہوگیا کہ ایس پی سلطان بیگ پولیس کی وردی پہن کر قاتلوں کی سرپرستی کرتا ہے۔"

"جس مقتول کو تم معزز شخص کہتے ہو وہ کسی دشمن ملک کا ایجنٹ تھا۔ سلطان بیگ کو گرفتار مت کرو۔ جاؤ اس نیک آدمی کو سلام کرو۔ اس کی وطن دوستی سے یہ کیمپ قائم ہوا ہے۔ ذرا دماغ سے سوچو۔ ہم قبائلیوں کو تمہارے ملک سے کیا لینا ہے؟ کیا دینا ہے؟

کچھ نہیں۔ ہمارا کوئی مطلب' کوئی غرض نہیں ہے۔ ہم صرف مسلمان ہونے کے ناطے سلطان بیگ کی پشت پناہی کررہے ہیں۔ تمہاری حکومت ایک بہت بڑے کافر ملک کے دباؤ میں رہتی ہے۔ اس سے امداد لیتی ہے مگر نقصان اٹھاتی ہے۔ سلطان بیگ ہم مسلمانوں سے مدد حاصل کرتا ہے۔ تمہارے شہروں میں دہشت گردوں کے خلاف محاذ بناتا ہے تم انصاف سے بولو کافر سے مدد لینے والے تم مسلمان ہو یا ہم مسلمانوں سے تعاون حاصل کرنے والا سلطان بیگ مومن ہے؟"

میجر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ سے بحث نہیں کروں گا۔ آپ کی باتیں اعلیٰ حکام تک پہنچادوں گا۔ میں اپنی فوج واپس لے جارہا ہوں۔"

ان کی گفتگو کے دوران بہت بڑا دسترخوان بچھایا جاچکا تھا۔ کچھ پکوان کچھ تازہ مشروبات لاکر رکھے گئے تھے۔ سردار نے کہا۔ "آؤ ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوجاؤ ہم مہمانوں کو خالی پیٹ اور خالی دماغ نہیں جانے دیتے۔ پیٹ بھرے گا تو ہماری باتیں سمجھتے ہوئے گھر جاؤ گے۔"

میجر آدھی رات کو کھانا نہیں چاہتا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا۔ اگر وہ کہے گا بھوک نہیں ہے تو اسے صبح تک روک لیا جائے گا تاکہ بھوک لگے اور وہ شکم سیر ہوکر انہیں مہمان نوازی کا موقع دے کر جائے۔ وہ جبراً فوجی جوانوں کے ساتھ کھانے کے بعد بولا۔ "اب اجازت دیجئے۔"

اسے اجازت مل گئی۔ سردار نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "جاؤ برادر! تم مہمان تھے' ہم نے تم کو نقصان نہیں پہنچایا۔ مگر بستی سے باہر جو تمہارے فوجی ہیں۔ ان میں سے دو افسروں کو چھوڑ جاؤ۔ وہ دو افسر ہماری پناہ میں رہیں گے۔ جب تم سلطان بیگ کو رہا کردو گے تو ہم ان دونوں کو عزت سے رخصت کردیں گے۔ جاؤ خدا حافظ۔"

وہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد خالدہ اور سرور بستی میں آگئے۔ انہیں معلوم ہوا کہ سلطان بیگ کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ خالدہ نے کہا۔ "سردار! آپ نے رہائی کی شرط رکھی ہے یقیناً میرے بھائی کو رہا کردیا جائے گا لیکن ہمیں شہر جانے کی اجازت دیجئے میرے بھائی کی بیوی بچے بہت پریشان ہوں گے۔ مجھے ان کی دل جوئی کے لئے وہاں رہنا چاہئے۔"

سردار نے کہا۔ "جس کی دلجوئی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا' خدا اسے صبر دیتا ہے تم ان کی پرواہ مت کرو۔ سلطان بیگ کل صبح تک اپنے گھر پہنچ جائے گا۔ ہم نے کہہ دیا تم میاں بیوی سات دنوں تک ہمارے مہمان رہو گے۔ انشاء اللہ ہماری مہمان نوازی میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔"

دوسری صبح خالدہ اور سرور نے میدانی علاقے میں جاکر دیکھا۔ بہت سے خیمے بم کے دھماکوں سے اڑ گئے تھے۔ تقریباً پچیس جوان مارے گئے تھے اور چالیس بری طرح زخمی ہوئے تھے۔ انہیں پوری توجہ سے طبی امداد پہنچائی جارہی تھیں۔ وہ دونوں تمام دن ان کی تیمارداری میں لگے رہے۔ شام کو پھر بستی میں آگئے۔ وہاں فوج کے دو افسروں کو یرغمال بناکر رکھا گیا تھا۔ شہر سے خبر آئی تھی کہ سلطان بیگ کو رہا نہیں کیا جائے گا لیکن اسے کسی طرح اذیت نہیں دی جائے گی' اے کلاس قیدی بنا کر رکھا جائے گا۔ سردار سے درخواست کی گئی تھی کہ ان کے فوجی افسروں کے ساتھ بھی بہتر سلوک کیا جائے۔

سرور نے کہا۔ "سردار انہوں نے سلطان صاحب کی رہائی کا معاملہ ٹال دیا ہے۔ میں جانتا ہوں' عالی جناب اور چند اعلیٰ حکام کی کمزوریاں ان فائلوں میں مکمل ثبوت کے ساتھ ہیں جنہیں سلطان صاحب اپنے جوانوں کے ذریعے ان کی تحویل سے نکال لائے ہیں۔ ان فائلوں کے ذریعے ان تمام عزت داروں اور عہدیداروں کا تعلق ڈرگ مافیا سے ثابت ہوگیا ہے لہٰذا سلطان صاحب کی رہائی کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ ایسی صورت میں خالدہ کو اپنے بھائی کے بیوی بچوں کے قریب رہنا چاہئے۔ ڈرگ مافیا سے تعلق رکھنے والے انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ ہماری موجودگی سے ان کی فیملی کو تقویت پہنچے گی۔"

سردار نے انہیں اجازت دے دی۔ وہ دوسری صبح کیمپ میں آئے۔ ریاست علی کو ایک خیمے میں بیڑیاں پہنا کر چھوڑ دیا گیا۔ اس نے گڑگڑا کر کہا۔ "مجھے معاف کردو' یہاں سے رہائی دلادو۔ میں زندگی بھر تمہارا احسان نہیں بھولوں گا۔"

خالدہ نے پوچھا۔ "اگر میں تمہاری قید میں ہوتی تو کیا تم مجھے معاف کردیتے؟ تم لوگ شہ زوری کے دور میں اپنی کمزوریوں کو کیوں بھول جاتے ہو؟"

"اب نہیں بھولوں گا۔ کان پکڑتا ہوں۔ توبہ کرتا ہوں تمہیں بہن سمجھتا ہوں۔"

"اتنی جلدی نیت اور رشتہ کیسے بدل گیا؟"

"تم نے دیکھا ہے۔ رائفل شوٹنگ کی تربیت حاصل کرنے والے میرے خیمے کے پیچھے فائر کرتے ہیں۔ ان اناڑیوں کی ایک آدھ گولی میری طرف آسکتی ہے۔ میں تمام دن زمین پر اوندھا لیٹتا ہوں۔ مجھے بارہ گھنٹے میں آدھا گلاس پانی اور آدھی روٹی دی جاتی ہے۔ میرے زخموں پر پتا نہیں کیسی دوائیں لگائی جاتی ہیں' یہ بھرتے نہیں ہیں اور بڑھتے ہیں میں تکلیف سے نڈھال ہوجاتا ہوں' مجھے چھوکر دیکھو' میں بخار میں تپ رہا ہوں۔ میں ایسے میں مرجاؤں گا۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔"

خالدہ نے کہا۔ "اسی طرح اوندھے پڑے رہو۔ آنکھیں بند کرلو اور بلو کا تصور کرو۔ اگر تم نے واضح طور پر اس ننھے معصوم کی آخری سانس کو اکھڑتے دیکھ لیا تو پھر کبھی اپنے لئے رحم کی بھیک نہیں مانگو گے۔"

وہ خیمے سے باہر آگئی۔ سرور گاڑی کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ وہ گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "بلو کے بارے میں زیادہ نہ سوچا کرو۔ تمہارا چہرہ بتا دیتا ہے کہ ایک ماں غیظ وغضب میں ہے۔"

اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگاکر آنکھیں بند کرلیں اور خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ شام کو وہ اپنی شہر والی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ سرور اسے راستے بھر بہلاتا رہا تھا۔ اپنی زندہ دلی سے ہنسانے کی کوشش کرتا رہا تھا وہ ہنستی تو نہیں تھی لیکن مسکرا دیتی تھی۔ وہ رات انہوں نے پیار ومحبت سے گزاری۔ دوسری صبح فون کی گھنٹی سن کر آنکھ کھلی۔ سرور نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو؟"

دوسری طرف سے کسی خاتون نے پوچھا۔ "ہیلو آپ کون ہیں؟ میں بیگم خالدہ امانت سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"محترمہ! اب یہ بیگم خالدہ سرور ہوگئی ہیں اور یہ ناچیز سرور آپ سے ہم کلام ہے۔ کیا آپ اپنا نام بتانا پسند کریں گی؟ میری بیگم ابھی باتھ روم میں ہیں۔"

دوسری طرف سے رابطہ ختم ہوگیا۔ خالدہ نے غسل خانے سے نکل کر پوچھا۔ "کس کا فون تھا؟"

"کوئی محترمہ تھیں۔ میری آواز پسند نہیں آئی۔ فون رکھ دیا۔"

خالدہ نے مسکراتے ہوئے ریسیور اٹھایا۔ نمبر ڈائل کئے پھر رابطہ قائم ہونے پر کہا۔

"بھابی! میں خالدہ بول رہی ہوں۔ مجھے بھائی صاحب کی گرفتاری کا علم ہے۔ آپ اطمینان رکھیں' انہیں اے کلاس قیدی کی حیثیت سے رکھا گیا ہے۔ میں ابھی دس بجے تک آپ کے پاس آ رہی ہوں۔"

اس نے تھوڑی دیر تک بیگم سلطان بیگ کی باتیں سنیں پھر انہیں تسلیاں دے کر ریسیور رکھ دیا۔ سرور نے باتھ روم سے پوچھا۔ "خیریت تو ہے؟"

خالدہ نے کہا۔ "پولیس والے بھابی اور بچوں کو پریشان کر رہے ہیں۔ ان کی کوٹھی کی تلاشی لی گئی ہے اور یہ کیس بنایا گیا ہے کہ تلاشی لینے پر سلطان بیگ کے گھر سے ایسی دستاویزات برآمد ہوئی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ دشمن ملک کا ایجنٹ ہے۔"

"ہاں ایسے الٹے سیدھے کیس بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ہمارے خفیہ کیمپ کو ختم کرنے کے لئے سلطان صاحب کے کیس کو بہت الجھایا جائے گا۔"

وہ آٹھ بجے ناشتے کی میز پر آئے۔ ملازمہ نے اطلاع دی کہ ریاست علی کی بیوی ہیرا ملنے آئی ہے' خالدہ نے کہا۔ "ان محترمہ کو یہیں لے آؤ۔"

ہیرا ڈائننگ روم میں آئی۔ اس کی گود میں ایک ننھی سی بچی تھی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "ابھی میں نے فون کیا تھا۔ ایک شخص نے خوش خبری سنائی کہ آپ بیگم سرور بن گئی ہیں۔" وہ سرور کو دیکھ کر بولی۔ "کیا آپ ہی سرور صاحب ہیں؟"

"جی ہاں۔ آپ تشریف رکھیں اور ہمارے ساتھ ناشتے میں شریک ہو جائیں۔"

وہ خالدہ کے سامنے میز کے دوسری طرف بیٹھتے ہوئے بولی۔ "میری تو بھوک پیاس مر گئی ہے۔ مجھے اپنے میاں کا ایک خط ملا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ آپ ان کی قید میں ہیں لیکن یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہے کیا واقعی آپ دونوں میاں بیوی ہیں؟"

"ہاں ضرورت ہوئی تو نکاح نامہ دکھا دوں گی۔"

"آپ نے کہہ دیا' مجھے یقین ہو گیا لیکن ریاست نے مجھے ایسا خط کیوں لکھا؟"

خالدہ نے پوچھا۔ "اس نے جیسا خط لکھا تم نے جواباً کوئی قدم اٹھایا ہوگا؟"

"ہاں۔ اس نے لکھا تھا' وہ آپ کو اغوا کر چکا ہے اور آپ کو اپنی بیوی بنانے کے لئے مجھے طلاق دینا چاہتا ہے اس خط سے وہ اغوا کرنے کا مجرم ثابت ہوتا تھا میں نے اس

خط کی نقل اور دو بھائیوں کے درمیان ہونے والے معاہدے کی کاپیاں پولیس والوں تک پہنچا دیں۔ پولیس والے ریاست کو تلاش کر رہے ہیں۔ اب آپ ہی جواب دے سکیں گی کہ آپ کو اغوا کرنے والا کہاں ہے؟"

"شیطان کا پتا سب ہی جانتے ہیں وہ کسی جہنم میں ہوگا۔"

ہیرا نے کہا۔ "مجھے ان سے دلی لگاؤ نہیں رہا مگر کیا کروں' وہ میری بچی کے باپ ہیں۔ میں اپنا نہ سہی بچی کا حق حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ ایک پولیس افسر نے کہا تھا۔ میں آپ کی کوٹھی میں برابر فون کرتی رہوں۔ اس اغوا کے کیس میں کچھ گڑبڑ ہے۔ آپ ضرور یہاں آئیں گی اور جب بھی آئیں گی تو میں پولیس کو اطلاع دوں گی۔"

"تو تم نے اطلاع دے دی؟"

"نہیں۔ یہ سن کر میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا کہ آپ بیگم سرور بن گئی ہیں۔ آپ نے یہ نئی زندگی شروع کی ہے۔ میرا بھلا ہو رہا ہے۔ ریاست مجھے طلاق نہیں دے گا۔ میری بچی پر باپ کا سایہ رہے گا۔ پھر میں آپ سے دشمنی کیسے کر سکتی ہوں؟ میں دو باتوں کے لئے آئی ہوں۔ ایک تو اپنے شوہر کا پتا پوچھنے' دوسرا یہ سمجھانے کے لئے کہ پولیس والوں کے ارادے خطرناک ہیں۔ وہ شاید آپ کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔"

خالدہ نے کہا۔ "تمہاری اس محبت بھری اطلاع کا شکریہ۔ ریاست مجھے اغوا کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے اسے اغوا کر کے ایسی جگہ پہنچایا ہے جہاں کا پتا یہاں کی پولیس اور فوج والوں کو بھی معلوم ہو چکا ہے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم سے پوچھ گچھ ہوگی کیونکہ ہمارا نکاح اسی آزاد علاقے میں ہوا ہے۔ یہاں کے اعلیٰ افسران ہمارے اور ریاست کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں لیکن یہ بات عوام تک نہیں لاسکتے۔ اس لئے تمہیں بھی ریاست کے متعلق صحیح بات نہیں بتائی گئی ہے۔ بہرحال میں اپنے بھائی سلطان بیگ کی محبت سے مجبور ہو کر آئی ہوں۔ اگر وہ سلامت رہے گا تو میں وعدہ کرتی ہوں تمہاری بچی کے سر پر باپ کا سایہ بھی سلامت رہے گا۔"

ملازمہ سہمی ہوئی آئی۔ اس نے کہا۔ "پولیس نے کوٹھی کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ مالکن! وہ آپ کو پوچھ رہے ہیں۔"

ہیرا نے اپنی بچی کو سینے سے لگا کر کہا۔ "میں اپنی بیٹی کی قسم کھا کر کہتی ہوں' میں نے

پولیس کو اطلاع نہیں دی ہے۔"

خالدہ نے کہا۔ "قسم نہ کھاؤ‘ مجھے یقین ہے تم یہاں آتیں یا نہ آتیں۔ پولیس والوں کو تو یہاں آنا ہی تھا۔"

کوٹھی کے باہر ایک افسر میگا فون پر کہہ رہا تھا۔ "بیگم خالدہ! اپنے آدمی کے ساتھ خالی ہاتھ اٹھا کر باہر آؤ۔ ورنہ ہم شیلنگ کر کے باہر آنے پر مجبور کردیں گے۔"

خالدہ اور سرور نے باہر آکر دیکھا۔ تمام پولیس والے دیواروں اور گاڑیوں کی آڑ میں رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ کوٹھی کے اندر مسلح دہشت گرد ہوں گے اور وہ مقابلے پر اتر آئیں گے۔ خالدہ اور سرور نے خالی ہاتھ آکر خود کو گرفتاری کے لئے پیش کردیا۔

پولیس والے انہیں حوالات میں لائے۔ اپنے اعلیٰ افسران سے فون پر گفتگو کی پھر انہیں پولیس کی بند گاڑی میں بٹھا کر ٹارچر سیل میں پہنچادیا۔ ایک گھنٹے بعد وہاں عالی جناب اور چار فوجی افسران آئے۔ ایک افسر نے پوچھا۔ "تم دونوں میاں بیوی ہو؟"

سرور نے کہا۔ "جی ہاں۔ ہمارا نکاح ایک قبائلی بستی میں ہوا ہے‘ جس کے قریب محبانِ وطن نے ایک ٹریننگ کیمپ قائم کیا ہے۔ اس کیمپ سے ہمارا بھی تعلق ہے۔ بلکہ ہر اس شخص کا تعلق ہے جو اپنے وطن سے محبت کرتا ہے۔"

دوسرے افسر نے کہا۔ "تم جسے وطن سے محبت کہہ رہے ہو‘ وہ وطن سے دشمنی ہے۔ لفظوں کے ہیر پھیر سے تم لوگ اپنے ناپاک عزائم کو چھپا نہیں سکتے۔"

"آفیسر! بات اصل میں چھپانے کی ہے۔ ہم چھپا رہے ہیں یا تم چھپا رہے ہو۔ اپنے عوام سے اپنے معصوم اور پُرامن شہریوں سے اصلیت ہم چھپا رہے ہیں یا تم چھپا رہے ہو؟ مگر تم اس کا جواب نہیں دو گے اس لئے کہ تم حکم کے بندے ہو۔ جس پر گولی چلانے کا حکم دیا جاتا ہے‘ اس پر اندھا دھند گولیاں چلاتے ہو اور جو لوگ تمہیں حکم دیتے ہیں‘ وہ ڈرگ مافیا جیسی تنظیموں اور ملکی سیاست کا رخ بدلنے والے بڑے ملکوں کے دباؤ میں رہتے ہیں۔ ذرا سوچو آفیسر! جب وطن اور عوام کے محافظ حقیقت سے بے خبر رہ کر اپنے ہی لوگوں پر گولیاں چلائیں گے اور دہشت گردوں کو بچ نکلنے کا موقع دیں گے تو اس ملک کو کون بچائے گا؟"

سرور یہ سوال کر کے ذرا چپ ہوا۔ عالی جناب نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "اچ ملک کو بچانے کا ٹھیکہ تم نے لیا ہے؟"

"جی ہاں۔ آپ یاد کریں میں نے پہلی بار گابے جی اور جیلر جبار خان کو رنگے ہا پکڑا تھا۔ آپ بھی وہاں تشریف لائے تھے۔ ان کا جرم آئینے کی طرح صاف تھا لیکن نے ڈرگ مافیا کے دباؤ میں آکر وہ فائل غائب کرانے کی کوشش کی۔ آپ کی وہ کوشش ناکام ہوئی۔ کیونکہ تین مختلف وارداتوں کی فائلیں ہمارے محب وطن جوانو غائب کردیں۔ وہ فائلیں اب ایسی جگہ موجود ہیں جہاں سے انہیں کسی وقت بھی کسی انصاف پرور عدالت میں پیش کیا جاسکتا ہے لیکن وہ عدالت کہاں ہے جو بااختیار ہوتا ہے اور آپ لوگوں کے زیر اثر نہیں رہتا؟ اس اندھیر نگری میں ابھ انصاف نہیں ملے گا۔ اس لئے.......... ہم نے تمہاری ڈرگ مافیا کی سرپرستی کے ہتھیار اٹھائے ہیں۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ ہم تمہارے دہشت گردوں کے ہتھیار جواب خود ہتھیار اٹھا کر دے رہے ہیں۔ اگر آپ لوگوں نے شیطانوں کی سرپر پالیسی نہ بدلی تو آنے والے دنوں میں اس اندھیر نگری کا ایک ایک آدمی ہتھیار اٹھا جب ہر ہاتھ میں اور ہر گھر میں ہتھیار ہوگا تو پولیس اور انتظامیہ کی کیا ضرورت ر تم سب حرف غلط کی طرح مٹ جاؤ گے۔"

ایک افسر نے اس کے منہ پر الٹا ہاتھ مارا پھر اپنا ہاتھ سہلاتے ہوئے بولا۔ فولاد کا ہے۔ تجھ جیسے باغی فولاد کو ہم پگھلانا جانتے ہیں۔" اس نے چند جلاد قسم کے طلب کیا پھر حکم دیا۔ "اس پر ظلم کی انتہا کردو۔ جب تک یہ ان فائلوں کو ہمار کرنے کو تیار نہ ہو‘ اس وقت تک اس کا سانس لینا دوبھر کردو۔"

خالدہ نے کہا۔ "صرف تین فائلوں کے لئے اتنے پاگل ہو رہے ہو۔ آئندہ ا ٹھوس ثبوت تمہارے خلاف حاصل ہوتے رہیں گے اور ہمارے کتنے جیالے نو لوگوں کا محاسبہ کرتے رہیں گے۔ تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے۔"

عالی جناب نے کہا۔ "جن قبائلیوں کے بل بوتے پر اتنی باتیں کر رہی ہو‘ ان سے ہم دشمنی مول لینا نہیں چاہتے لیکن ہماری حکمتِ عملی سے ان سرحدی راستوں کی نا بندی ہو رہی ہے۔ فوج کا اتنا سخت پہرہ ہوگا کہ تمہارے کیمپ کا کوئی جوان ہماری سرحد

میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں آئندہ کی فکر نہیں ہے۔ تم آج کی فکر کرو۔ تم نے ایک شوہر کو ہضم کرلیا' دوسرے پر رحم کھاؤ۔ فائلوں کی نشاندہی کرو اور اسے مرنے سے بچالو۔ ویسے ہم اسے ماریں گے نہیں' زندہ رکھیں گے لیکن مردے سے بدتر بنا دیں گے۔"

اس نے حکم دیا۔ "لے جاؤ اس عورت کو سنا ہے جب سے اس کا بچہ مرا ہے اس کی دولت کے کتنے ہی طلب گار اس سے ایک وارث پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اسے دوسرے سیل میں لے جاؤ اور اس سے پوچھو' یہ فائلیں برآمد کرے گی یا ٹارچر سیل میں رہ کر وارث پیدا کرتی رہے گی۔"

سرور نے گرج کر کہا۔ "اگر کسی نے میری عزت کو ہاتھ بھی لگایا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

دو مسلح جوان مرد' خالدہ کو پکڑ کر دوسرے سیل میں لے جانا چاہتے تھے۔ سرور تڑپ کر آگے بڑھا۔ پیچھے سے رائفل کا کندا اس کے سر پر پڑا۔ وہ ذرا لڑکھڑایا۔ کوئی اور ہوتا تو چکرا کر گر پڑتا مگر پہاڑ کو پتھر مارنے والی بات تھی۔ اس نے سنبھل کر چھلانگ لگائی۔ خالدہ کو لے جانے والے دونوں دشمنوں کی گردنیں پیچھے سے دبوچ لیں۔ اس کے بازو فولاد کے تھے' جن کی گردنیں پھنس گئی تھیں' ان کے دیدے پھیل گئے تھے اور وہ شکنجے سے نکلنے کی ناکام کوششیں کر رہے تھے۔ پیچھے سے کئی مسلح شخص اسے لاتوں اور گھونسوں سے مار رہے تھے۔ پھر انہوں نے رائفلوں کے کندوں سے مارنا شروع کیا۔ وہ مار کھا رہا تھا۔ لہو لہان ہو رہا تھا۔ مگر اس پر جنون سوار تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دونوں کی گردنیں چھوڑ دیں۔ وہ زبان کا پکا تھا پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ خالدہ کو ہاتھ لگانے والا زندہ نہیں رہے گا۔ وہ دونوں بے جان ہو کر فرش پر گر پڑے تھے۔

وہ سب چند لمحوں کے لئے ساکت رہ گئے۔ آج تک ٹارچر سیل میں آنے والا کوئی قیدی ایسا جی دار نہیں تھا۔ خالدہ ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کے سامنے ڈھال بن کر زخمی درندے کی طرح ہانپتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "یہ میری شریکِ حیات ہے۔ اس کی عزت میری عزت ہے۔ ہم نے اللہ اور رسولؐ کے نام پر ازدواجی رشتہ قائم کیا ہے' اس کے باوجود یہ نہیں چاہتی کہ تمہاری بے رحم قاتل دنیا میں دوسرا ببلو پیدا کرے۔ تم کتنے

ذلیل اور کمینے ہو ایک مظلوم عورت کی عزت کی دھجیاں اڑانا چاہتے ہو۔ آؤ کون مرد کا بچہ ہے جو میری عزت کو ہاتھ لگائے گا۔"

کتنے ہی مسلح افراد نے اس پر حملہ کیا۔ وہ مار کھانے لگا اور کبھی مارنے بھی لگا۔ خالدہ بھی ساتھ دے رہی تھی۔ وہاں اچھی خاصی جنگ چھڑ گئی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ وہاں سے زندہ نہیں نکل پائیں گے اور ان پر حملے کرنے والے گولی مارنا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں زندہ رکھ کر اہم راز اگلوانا چاہتے تھے۔ نہ رہائی چاہنے والوں کے لئے فرار کا راستہ تھا اور نہ ہی وہ کسی کے قابو میں آ رہے تھے۔ دونوں میاں بیوی زخم پر زخم کھا رہے تھے۔ اپنے لہو میں ڈوب رہے تھے اور آثار بتا رہے تھے کہ آخر کار دونوں بے دم ہو کر گر پڑیں گے۔ ایسے ہی وقت ایک افسر کا ریوالور خالدہ کے ہاتھ میں آگیا۔ اس نے ٹھائیں سے گولی چلائی۔ سب ایک دم سے بوکھلا گئے۔ جو جہاں تھا' وہیں کھڑا رہ گیا۔ چند ساعتوں کے لئے سب پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

خالدہ نے دونوں ہاتھوں سے ریوالور کو تھام رکھا تھا اور عالی جناب کو نشانے پر رکھ کر کہہ رہی تھی۔ "خبردار! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔ یہاں جان کی بازی لگی ہے اور کوئی نہیں جانتا کس کی جان جانے والی ہے۔"

سرور آخر انسان تھا۔ اس کے جسم پر اور سر پر اتنی رائفلوں کے کندے مارے گئے تھے کہ وہ ٹوٹ ٹوٹ گیا تھا۔ سر کے بال اور چہرہ لہو میں ڈوب گیا تھا' وہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ آگے پیچھے ڈگمگاتا ہوا خالدہ کے قریب آ رہا تھا۔ عالی جناب نے کہا خالدہ! اگر وہ فائلیں نہ ملیں تو مجھے ایسے بھی مرنا ہے۔ تم مجھے گولی مار کر اور کتنوں کو مار سکو گی؟ اس میں چھ گولیاں ہیں۔ یہاں بارہ سپاہی ہیں ٹارچر سیل کے باہر درجنوں مسلح سپاہی ہیں۔ تمہارے لئے فرار کا راستہ ممکن نہیں ہے۔

وہ بولی۔ "فرار کا راستہ وہ ڈھونڈتے ہیں' جنہیں زندہ رہنے کی آرزو ہوتی ہے۔ میں تو ہاتھ میں یہ ریوالور لے کر اپنے مجازی خدا سے دو باتیں کرنے کی مہلت چاہتی ہوں۔"

اس نے سرور سے کہا۔ "میں اسی دن کے لئے شادی سے انکار کرتی تھی۔ میں نے قسم کھائی تھی' میرے وجود سے کوئی بچہ جنم نہیں لے گا لیکن میں تمہاری مردانگی کی اسیر

ہے۔

آہ! یہ جذبات کہاں سے کہاں بہا کر لے جاتے ہیں۔ ہمیں سوچنے سمجھنے کا موقع
یں دیتے کہ ہماری گلی' ہمارے شہر مقتل بن گئے ہیں اور ہم بچوں کو اس مقتل میں لانے
ے لئے جذبوں میں اندھے بن رہے ہیں۔

کیا ہم ایسی اندھیر نگری کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھا سکتے؟ انہوں نے یقیناً بھائی
ن کو مار ڈالا ہے لیکن ایک کی موت سے کیا ہوتا ہے کیا گھر گھر میں سلطان بیگ کا
سلہ پیدا نہیں ہوسکتا؟ اگر نہیں ہوسکتا تو میں پہلی عورت احتجاج کے طور پر اپنی کوکھ کو
ل رہی ہوں۔"

اس نے ریوالور کی نالی اپنے پیٹ پر رکھی۔ ٹرائیگر پر انگلی رکھی پھر کہا۔ "لوگو! میں
ہیں شرم دلانے کی ابتدا کر رہی ہوں۔ انتہا اپنی ماؤں سے پوچھ لینا۔"

یہ کہتے ہی اس نے ٹرائیگر کو دبا دیا۔ فائر کی ایک آواز گونجی پھر وہ بے جان ہو کر
سرور کے اوپر آ گئی۔ وہ پہلے ہی فرش پر ابدی نیند سو رہا تھا۔

☆======ختم شد======☆